مطالعۂ غالبؔ شرح اشعارِ غالبؔ

دیوانِ غالبؔ سے 40 اشعار کی شرح

جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی

PDF By : Ghulam Mustafa Daaim

مطالعۂ غالبؔ شرح اشعارِ غالبؔ

دیوانِ غالبؔ سے 40 اشعار کی شرح

جعفر علی خان اثرؔ لکھنوی

PDF By : Ghulam Mustafa Daaim

خالص اللہ کی رضا اور جذبہ خدمتِ خلق کے تحت کتب کی پی ڈی ایف فائلز بنائی جاتی ہیں۔

کسی بھی قسم کا کاروباری مفاد پیشِ نظر نہیں۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ شکریہ

PDF By : Ghulam Mustafa Daaim Awan

For Fran
with lots of ♡
Satya
31-01-2009

مُطالعۂ غالب

اثر لکھنوی

دانش محل۔ امین الدولہ پارک لکھنؤ

مطالعۂ غالب

آثر لکھنوی ——— قیمت ۸ عمر

"یہ جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی کی تصنیف ہے اور
دانش محل لکھنؤ نے بڑے سلیقہ اور اہتمام سے شائع کی ہے
ابتدا میں مطالعہ غالب کے عنوان سے ایک چھوٹا سا
مقدمہ ہے اس کے بعد چالیس اُلجھے ہوئے اشعار کی
شرح اپنے زاویۂ نظر سے پیش کی ہے اور دیگر شارحین
سے اپنے اختلافات کی وجوہ بھی پیش کئے ہیں، آخر میں
مروجہ دیوان غالب اور نسخۂ حمیدیہ کے منتخب اشعار
بھی شامل کر دیے ہیں۔"

۱۷ مارچ ۵۳ء (ملخص تبصرہ منشور آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ)

دانش محل

امین الدولہ پارک ۔ لکھنؤ

فہرست

مطالعۂ غالب

تخلیقِ شعری ایک مرکب عمل ہے جس میں جذبات کے اجزائے ترکیبی ادراک و متخیلہ سے مل جل کر صورت کرمتنی ہوتے ہیں اسی میں تنوع و دلکشی کا راز ہے اور اسی کا کرشمہ ہے کہ جتنے بلند پایہ شاعر گزرے ہیں ان کے طرزِ بیان میں انفرادیت پائی جاتی ہے اسلوب میں ایک اپج ایک انوکھاپن ہوتا ہے۔ گویا ان کے خیالات اپنے اظہار کو زبان کا سانچا بھی خود ہی وضع کرتے ہیں

اردو شعرا میں یہ انوکھاپن میر کے بعد خصوصیت سے کلام غالب میں ملتا ہے اتنا فرق ہے کہ میر کے یہاں زبان و بیان کی گھلاوٹ قائم رہتی ہے غالب کے یہاں بعض اوقات فوت ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ سبب نہیں کہ غالب کے خیالات فلسفیانہ ہونے کے سبب سے دقیق پیچیدہ اور عام جادے سے ہٹ کر نظم ہوتے ہیں لہذا فارسی کی کڈھب ثقیل یا نامانوس تراکیب کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یا یہ کہ فارسی میں جتنی دستگاہ غالب کو تھی میر کو نہ تھی۔ میر کا ایک دیوان فارسی بھی موجود ہے اور اس نے غالب سے کہیں زیادہ فلسفیانہ خیالات شعر کے قالب میں ڈھال دیے ہیں۔ ایک مضمون میں دونوں کے ایسے اشعار کا موازنہ کر چکا ہوں [1]۔ اردو میں فارسی تراکیب کا صحیح و شگفتہ و برجستہ استعمال

---

[1] ملاحظہ ہو کلام غالب پر ایک نظر۔ اثر

میر کی استعدادِ علمی کا بیّن ثبوت ہے۔ اُس کا عربی کا مطالعہ غالب سے وسیع تر تھا۔ غالب کو عربی میں معمولی شُد بُد تھی جیسا کہ اُن کے خطوط سے واضح ہوتا ہے اور "ضروری الاظہار" "اصلاح بین الذاہبین" ایسے غلط فقرے گڑھنے سے ثابت ہوتا ہے۔ میر کا شغل بیکاری "مطول خوانی" تھا۔ دونوں کی افتادِ مزاج اور حالاتِ زندگی پر غور کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ میر میں خود فراموشی کا ملکہ تھا۔ وہ ہنگامِ فکرِ شعر بھول جاتا تھا کہ اُس کے سوا کوئی دوسرا بھی اُس کے آفریدگانِ تخئیل کو دیکھے گا یا پرکھے گا۔ اکثر شعر کہتے وقت اُن کی محویت و استغراق کا یہ عالم ہوتا تھا کہ لوگ آتے تھے، بیٹھتے تھے اور اُٹھ کر چلے جاتے تھے لیکن وہ اُن کی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔ کمرے سے ملحق پائیں باغ ہے اور وہ بے گانہ۔ لوگ کلام سننے کا تقاضا کرتے تھے اور وہ ٹال دیتا تھا۔ یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اُس کی غزلیں گائی جائیں۔ اس کے برعکس غالب کو اپنا کلام سنانے کی ایسی دھن رہتی تھی کہ خالی کمرے کو شعر سنا رہے ہیں جہاں کچھ دیر بیشتر احباب کا مجمع تھا۔ سنانے کے علاوہ غزلیں خطوں میں نقل کرکے احباب کو بھیجتے تھے۔

دونوں شاعروں میں یہ فرق بھی ہے کہ میر رومانوی (ROMANTIC) شاعر تھا غالب کلاسی سسٹ (CLASSICIST)۔ میر کی شاعری میں شخصیت (PERSONALITY) جھلکتی ہے۔ غالب کی شاعری کردار (CHARACTER) کی آئینہ دار ہے۔ غالب کی شاعری وہ ہے جس کو ڈرائڈن (DRYDEN) "IMAGINATIVE POETRY OR WIT-WRITING" سے تعبیر کرتا ہے جس میں جذبات کا تناؤ نہیں ہوتا بلکہ غور و فکر سے وجود میں آتی ہے۔ خود غالب کو اعتراف ہے کہ پچیس برس کی عمر تک خیالی مضامین باندھا کیے۔ میر کی شاعری وجدان کی سرکردگی میں جذبات و واردات کی مصوری ہے۔ غالب کو یہ کاوش رہتی تھی کہ اسلوبِ ادا میں جدّت و ندرت پیدا کریں تاکہ اپنے ہم عصر شعرا میں

ممتاز ہی نہ رہیں بلکہ اُن پر سبقت لے جائیں. نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ آپ بے ساختگی
اور احساسِ انا ہیں میر ہے۔ جہاں لالۂ صحرائی میں رنگ بھرنے کی کوشش کی؟ اس کی فطری
رعنائی و زیبائی کا خون ہوا۔ یہ دھیان رہے کہ شعر کہنے کے بعد اُس کی نوک پلک درست
کرنا بالکل مختلف عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلام میر میں تراکیب و معانی شیر و شکر ہیں اور کلام
غالب میں تراکیب معانی پر چھائی ہوئی ہیں. کلام غالب میں پہلے ترکیب پر نظر پڑتی
ہے پھر مطلب کی طرف ذہن جھکتا ہے۔ میر کے مطالعہ میں عمل اس کے برعکس ہوتا ہے۔
ظاہر ہے کہ گفتگو دونوں کے ایسے کلام سے ہے جس میں فارسی تراکیب کا استعمال ہے۔
غالب ایک حد تک اپنی انفرادیت نمایاں کرنے میں کامیاب ہوئے اور ان کا یہ دعویٰ

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

جہاں تک اُن کے معاصرین کا تعلق ہے بالکل درست ہے کیونکہ لوگوں کی پسند اور طبائع
کا عام رجحان اس طرف تھا کہ شعر شرح کا محتاج نہ ہو بلکہ پڑھتے ہی دل میں اتر جائے اور
موجب کیف و انبساط ہو درآں حالیکہ غالب کی طبیعت دقت پسندی اور مضمون آفرینی
کی طرف مائل تھی۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ یہ راستہ دیدہ و دانستہ بدرجۂ مجبوری اختیار کیا تھا
کیونکہ اُن کے حریفوں میں ذوق زبان و محاورہ و روزمرہ کا بادشاہ مانا جاتا تھا۔ ادھر کلام
کی گرمی، بندش کی چستی، معاملہ نگاری و ادا بندی میں مومن کا طوطی بول رہا تھا۔ غالب کی
غیور طبیعت پامال راہیں اختیار کرنے سے ابا کر لی تھی اور شاید تحت الشعور میں یہ احساس
بھی کھٹک رہا تھا کہ ان حریفوں کو انہیں کے میدان میں شکست دینا کارے دارد۔ انفرادیت
پسندی اور فارسی کی مہارت و عمارست نے یہ سوجھایا کہ نہ صرف غیر معروف و پیچ در پیچ

تشبیہات واستعارات ہی استعمال لئے جائیں بلکہ شعر کو مشکل بنانے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی جائے۔ اُن کے خطوط سے اس ذہنیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک شعر اس طرح موزوں کیا۔

لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین   کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

کسی نے مطلب پوچھا تو فرمایا:

یہ بہت لطیف تقریر ہے۔ لیتا کو ربط چین سے ہے۔ کرنا مربوط ہے آہ و فغاں سے۔ عربی میں تعقید لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح و ملیح۔ ریختہ تقلید ہے فارسی کی۔ حاصل معنی مصرعین یہ کہ اگر دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا۔ نہ مرتا تو کوئی دن آہ و فغاں کرتا۔

یہ مطلب شعر کو اس طرح موزوں کرنے سے صاف ہو جاتا ہے

دیتا نہ اگر دل تمھیں لیتا کوئی دم چین   مرتا نہ تو کرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

مگر نہیں تعقید کو حسن سمجھ کر اور تعقید معنوی کو تعقید لفظی کہہ کر شعر کو بیکار ابہام و اغلاق بنا دیتے ہیں۔

شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اگر تعقید لفظی شعر کے مفہوم تک ذہن کی رسائی میں سدِ راہ ہو تو لفظی سے گزر کر معنوی ہو جاتی ہے۔ اسی الٹ پھیر نے اُن کے نہ معلوم کتنے اشعار کو معما یا چیستان بنا دیا ہے اور شارحین کو خوب خوب جدت طبع دکھانے، قیاس آرائی کرنے اور احمق بننے یا بنانے کا موقع ملا ہے۔

اس جدت طرازی کا یہ نتیجہ ہوا کہ اُن کی زندگی ہی میں ان کے اشعار کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا، کوئی کہتا تھا کہ ابھی شعر کہا ہے معنی بعد کو پہنائیں گے، کوئی کچھ کہتا تھا، کوئی کچھ حکیم آغا جان عیش نے تو بر سرِ مشاعرہ اُن کے منھ پر یہ قطعہ پڑھ دیا:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے — مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے — مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

بعض اوقات تو حضرت غالب اپنا کہا خود بھی نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود غالب نے اپنے دل کو طرح طرح سے سمجھایا ہے مثلاً۔

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

انجام کار جل کر کہا:

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور ذوق کو غضبناک ہو کر یوں مخاطب کیا:

فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ منست
راست می گویم من و از راست سر نتواں کشید — ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگِ منست

مجھے اپنا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک صاحب کو یہ زعم تھا کہ بلیرڈ (BILLIARDS) کے بہترین کھلاڑی ہیں، سوء اتفاق کہ مجھ سے کئی گیم (GAME) متواتر ہار گئے۔ میز، روشنی اور گیندوں کو الزام دینے کے بعد فرمایا کہ آپ پولو (POLO) بھی کھیلتے ہیں میں نے نفی میں جواب دیا، ارشاد ہوا کہ اگر کھیلتے ہوتے تو ہمارا آپ کا مقابلہ ہوتا۔

غالب کی اس عجوبہ ذہنیت کا سبب تلاش کرنے کہیں دور نہیں جانا ہے۔ خاندانی روایات و وجاہت نے ذاتی لیاقت و صلاحیت اور شاعری سے فطری مناسبت سے مل جل کر اور سب سے زیادہ اُن کے غرۂ فارسی دانی نے شاعری کے معاملہ میں ان کو خود پسند خود ستا بنا دیا تھا گو انسان کی حیثیت سے حق پژوہی، مروت و مروت، خوش مزاجی، دوست پرستی اور بذلہ سنجی کے صفات اُن میں بدرجۂ اتم موجود تھے تاہم العوام کالانعام پر ان کا

عقیدہ راسخ تھا۔ ذیل کی حکایت مزاح کے شمول سے قطع نظر اُن کے کردار کا آئینہ ہے حکم لگایا تھا کہ فلاں سال کے اندر مر جاؤں گا۔ جب ایسا وقوع پذیر نہ ہوا تو دوستوں نے پیشین گوئی غلط ثابت ہونے پر مبارکباد دی جواب دیا حکم غلط نہ تھا مگر چونکہ اس سال وبا نے عامۃ الخلق کا ستھراؤ کر دیا میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ اس ہڑبونگ میں شریک ہوں۔

ایجادِ بندہ ہی کا خبط تھا جس نے اردو میں طرزِ بیدل کو منتقل کرنے کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ فخریہ کہتے ہیں ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا ‌ ‌ ‌ اسداللہ خاں قیامت ہے

اس رنگ کے اشعار خاصی تعداد میں اُن کے منتخب کلام میں موجود ہیں۔ ان کا یہ فرمانا کہ دس پانچ رہنے دیے حقیقت کے خلاف ہے۔ نسخہ حمیدیہ تو ایسے اشعار سے پٹا پڑا ہے بیدل سے دل اُوب گیا تو دیگر اساتذۂ فارسی نظیری، ظہوری، جلال، اسیر وغیرہ کی طرف توجہ مبذول کی اور بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ ان کے مصرعے یا پورے پورے شعر بادنیٰ تغیر ترجمہ ہو کر اُن کے کلام میں داخل ہو گئے۔ اس کی متعدد مثالیں شعر الہند نیز آرگس کے مضامین میں درج ہیں۔ اُن کے علاوہ اور بھی ہیں۔ اس امر کی طرف اشارہ کرنے سے غالب کی منقصت مدِ نظر نہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ جس طرح فارسی میں شیخ علی حزیں کے "خندۂ زیرِ لبی" نے ان کی بے راہ روی کو ان کی نظر کے سامنے جلوہ گر کر دیا۔ طالب آملی کے "زہر نگاہ" اور عرفی شیرازی کی "برق چشم" نے "ہرزہ گردی" کا مادہ جلا دیا، ظہوری نے اپنی سرگرمی و گیرائی نفس سے بازو پر تعویذ اور کمر میں توشۂ سفر یا زادِ راہ یا نمرہ عیار نظیری نے لا ابالی پن کا خاتمہ کر دیا اور اس گروہ فرشتہ شکوہ نے ان کے کلک رقاص کو تدرو خرام و رامش میں موسیقار جلوے میں طاؤس اور پرواز میں عنقا بنا دیا انجام کار اردو میں بھی ایک خضر راہ مل گیا اور وہ

میر تھا۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے طرزِ بیدل سے تائب ہونے کے بعد حضرت غالب ناسخ لکھنوی کے تتبع پر مائل ہو گئے تھے۔ غالب ہی پر کیا موقوف ہے دہلی کے عام شعرا مع مومن شیفتہ و ذوق ناسخ کا لوہا مانے ہوئے تھے "یادگارِ غالب" کے علاوہ دیگر تذکروں میں درج ہے کہ مومن اور غالب دونوں نے ناسخی رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی مگر شکر ہے کہ ناکام رہے۔ دیکھا جائے تو ناسخ کے رنگ کے اشعار اس دور کے شعرائے دہلی کے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں۔ شیفتہ نے اپنے تذکرہ گلشن بے خار میں ناسخ کی تعریف کے پل باندھ دیے ہیں۔

اگر فارسی میں عرفی و نظیری وظہوری وغیرہ نے غالب کی دست گیری کی اور راہِ راست پر لگایا تو اردو میں یہی فرض میر نے ادا کیا جس کے وہ خود بھی معترف ہیں :-

غالب اپنا بھی عقیدہ ہے بقول ناسخ ۔۔۔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

نسخۂ حمیدیہ میں یہ شعر ہے :-

میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب ۔۔۔ جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

تذکروں کے علاوہ خود غالب کے خطوط پڑھیے۔ میر کے اشعار قلم برداشتہ لکھتے چلے جاتے ہیں اس کے کلام کا انتخاب کیا تھا اور یہ کام گہرے اور مسلسل مطالعہ کے بغیر سر انجام نہیں پاتا۔ دونوں کے چند اشعار پہلو بہ پہلو درج کیے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ غالب میر سے کس درجہ متاثر تھے۔

غالب	میر
بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے	ہوتا ہے یاں جہاں میں ہر روز و شب تماشا
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے	دیکھو جو خوب تو ہے دنیا عجب تماشا

غالبؔ

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

دائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

میرؔ

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

ذلیل اُس کی گلی میں ہیں تو ہیں آزردگی کیسی
کہ خوش تو واں ہوئے جہاں ہوا اعتبار اپنا

قصدِ طریقِ عشق کیا سب نے بعد قیس
لیکن ہوا نہ ایک بھی اُس رہ نورد سا

عشق اُن کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

اب پھر ہمارا اُس کا محشر میں ماجرا ہے
دیکھیں تو اُس جگہ کیا انصاف داد گر ہے

مری نمود نے مجھکو کیا برابر خاک
میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

آدم خاکی سے عالم کو جلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

ایسے اشعار کی تعداد بہت زیادہ ہے چند بطور نمونہ درج کر دیئے گئے حاشا اس بحث
کا یہ مقصد نہیں کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کو صدمہ پہنچے یا سرقہ کا متہم ٹھہرے بلکہ صرف یہ دکھانا

ہے کہ میر کے اسالیب بیان اور موضوعات سخن ذہن میں رچ گئے تھے اور طبیعت اُن راستوں پر گامزن ہونے لگی تھی جو میر طے کر چکا تھا۔ یہ غلط فہمی بھی پیدا نہ ہو کہ میری نظر میں غالب کی کائنات کچھ نہیں بلکہ جو کچھ ہے مانگے تانگے کا سامان ہے، لا واللہ! خود غالب میں طبیعت میں غضب کی پیدا تھی؛ اور اُس نے اردو میں بھی ایسے ایسے شعر کہے ہیں جو کسی بڑے سے بڑے فارسی شاعر کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اُس کے اس دعوے میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ:۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکے ہو رشک فارسی گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

مدعا کلام کی ناہمواری دکھانا اور اس کے وجوہ بیان کرنا تھا۔ ورنہ غالب نے اردو میں بھی عرفی نظیری وغیرہ کی ٹکر کے شعر کہے ہیں اور اسی جوش و خروش و آب و تاب کے ساتھ اُس کی پختہ مشقی کے کلام میں وہی درد و خستگی، وہی سوز و گداز، وہی سادگی و پرکاری ہے جو میر کا طرۂ امتیاز ہے، تاہم خود اس کی انفرادیت قائم ہے۔

میں نے مضمون شروع کیا تھا غالب کا انداز بیان دکھانے یا اُس کے فن سے گفتگو کرنے کو لیکن اپنی دھن میں نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

اُردو میں جہاں تک غزلیہ شاعری کا تعلق ہے فن کا مفہوم طرز ادا و اسلوب بیان تک محدود ہے "کیا کہا" کو اس قدر اہمیت نہیں دی جاتی جتنی کہ "کس طرح کہا"۔ کہ اسلوب تابع ہے زبان کا۔ لہٰذا فن کی نمود اور خوبی کا انحصار زبان کی صفائی، سلاست، محاورہ و روزمرہ کے برمحل و برجستہ استعمال، خوبصورت و خوش آہنگ تراکیب، بندش کی چستی، دل پذیر و روبستِ الفاظ پر سمجھا جاتا تھا۔ خیال کو چنداں اہمیت نہیں دی جاتی تھی، نہ اس شاعری کو وقیع سمجھا جاتا تھا جو دل کے بجائے دماغ کو اپیل کرے۔ ایسی شاعری کو "لٹھے گھمانے" سے

تعبیر کیا جاتا تھا یہی وجہ ہے شعرا اور ان کی شاعری کی تقسیم خیالات کی طرفگی و ندرت لطافت یا رفعت کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا معیار چند سر برآوردہ شعرا کا طرز ہے۔ یہ شاعر میر سودا، انشا، غالب، مومن، آتش و ناسخ ہیں۔ جہاں کلام میں سادگی اور صفائی پائی میر سے منسوب کر دیا۔ الفاظ میں جزالت اور دھوم دھام دیکھی سودا کا رنگ کہہ دیا۔ شگفتگی اور ہلکے پھلکے تشبیہات و استعارات دیکھے یا چوچلا ملا انشا یاد آیا۔ فارسی تراکیب کی بہتات ہوئی تو غالب کا دھوکا ہوا۔ طرزِ ادا میں تیکھا پن اور معشوق سے چلی کٹی دیکھی تو مومن بول اٹھا۔ زبان کے چٹخارے کے ساتھ ٹھہراؤ، ٹھہراؤ میں گرمی، گرمی میں بانکپن، بانکپن میں جاذبیت محسوس ہوئی تو آتش کو حصیرِ فقر و قناعت پر "ضربیں" لگاتے سن لیا۔ بعید از قیاس باتیں، پادر ہوا خیالات بھاری بھرکم جملے اور پے تلے فقرے ہوئے تو ناسخ کو مگدر ہلاتے اور ٹھیکیں لگاتے دیکھ لیا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ اردو میں کیا بلحاظ ہیئت اور کیا بلحاظ معنی صرف دو صاحبِ طرزِ شاعر ہوئے میر اور انشا۔ صرف انشا ایک مخصوص دائرے میں جداگانہ رنگ کا مالک ہے۔ باقی جتنے شاعر ہیں وہ سب میر میں سمائے ہوئے ہیں اور جو رنگ جس سے منسوب کیا جاتا ہے وہ چوکھے سے چوکھا میر کے یہاں موجود ہے۔ دوسرے شاعروں کے ہم رنگ اشعار اس کے کلام سے پیش کرنا اس مضمون سے غیر متعلق ہے۔ صرف ایسی مثالیں پیش کی جاتی ہیں جو روا روی میں یاد آگئیں جن سے کلام غالب مماثل ہیں۔

حریفِ بے جگر ہے صبر ورنہ کل کی صحبت میں — نیاز و ناز کا جھگڑا گرو تھا ایک جرأت کا

یک بیاباں برنگِ صورتِ جرس — مجھ پہ ہے بےکسی و تنہائی

ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا — پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم — یک شعلہ برقِ خرمنِ صد کوہِ طور تھا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پر پیچ و تاب — شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

جب سے ناموس جنوں گردن بندھا ہے تب سے میر — جیب جاں وابستۂ زنجیر تا داماں ہوا

نخچیر گاہِ عشق میں افراطِ صید سے — روح الامیں کا نام شکار زبوں ہوا

جو ہے سو مست بادۂ وہم و خیال ہے — کس کو ہے یاں نگاہ کسو دُرد نوش پر

اشک کی لغزشِ مستانہ پہ مت کیجیو نظر — دامنِ دیدۂ گریاں ہے مرا پاک ہنوز

ایک پرواز کو بھی رخصت صیاد نہیں — ورنہ یہ کنج قفس بیضۂ فولاد نہیں

غم فراق ہے دنبالہ گرد عیش و وصال — فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا — اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

اس وقت ہے دعا و اجابت کا وصل میر — اک نعرہ تو بھی پیش کش صبحگاہ کر

فتنہ در سر بتانِ حشر خرام — ہائے رے کس ٹھسک سے چلتے ہیں

وہ فارسی تراکیب مثلاً کاوکاو، شیشہ بازی، سادہ و پُرکار، ستم ظریفی وغیرہ غالب جن کے مخترع سمجھے جاتے ہیں سب میر کے یہاں موجود ہیں۔

کاوِ کاوِ مژہ یار و دل زار و نزار — گتھ گئے ایسے شتابی کہ چھڑایا نہ گیا

ہے یار کیا ہی اپنا، پُرکار و سادہ سادہ
اس کی ستم ظریفی کس کے تئیں دکھاؤں

شیشہ بازی تو ذرا دیکھنے آ آنکھوں کی — ہر پلک پر مرے اشکوں سے رواں ہے شیشہ

میں انشا کو دوسرا صاحب طرز شاعر اس لیے مانتا ہوں کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اردو میں فینسی (FANCY) یعنی نازک اور لطیف تشبیہوں اور استعاروں کا اضافہ کیا اُس سے بیشتر تخئیل اور محض تخئیل (IMAGINATION) کارفرما تھی۔ مندرجہ ذیل

رنگ کے اشعار اُس سے بیشتر کے یا اُس کے ہم عصر شاعروں کے کلام میں آپ نہ پائیں گے۔

صرف چند نمونے:

غنچۂ گل کی صبا گودھری جاتی ہے — اک پری آتی ہے اور ایک پری جاتی ہے

غش نسیم سحری ہے مجھ پر — میں نسیم سحری پر غش ہوں

تجھ سی نازک پری کو چاہتے ہے — صرف پھولوں کے ہار کا جھولا

نکہت گل کے جھولنے کے لئے — ہے نسیم بہار کا جھولا

انکھڑیاں سرخ ہوگئیں چٹ سے — دیکھ لیجئے کمال بوسے کا

لگا کے برف میں ساقی صراحیٔ مے لا — جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

(اور غیر متعلق سہی)

گرا جو ہاتھ سے فرہاد کے کہیں تیشہ — درونِ کوہ سے نکلی صدائے واویلا

ہندی تلمیحات کا استعمال بھی اُس لے بافراط کیا ہے۔ اُس سے بیشتر ایسے اشعار غزل میں خال خال نظر آتے ہیں جن کو اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ غالب کو اگر کسی نہج سے صاحب طرز کہا جا سکتا ہے تو بیدل کے ہم رنگ اشعار کی بنا پر، لیکن اس طرز پر ان کی شاعرانہ عظمت کا انحصار نہیں بلکہ اسی نے اُن کو مطعون کیا۔ اردو میں اُس کی کھپت نہیں۔ اگر خوش نما اور عام فہم فارسی تراکیب کو لیجئے تو اس میدان میں بھی میر اُن سے کہیں آگے ہے اور شاید مومن سے بھی کور دبے۔ رہ گئے صاف اور سادہ اشعار جو فصاحت کی جان ہیں اور بجا طور پر سہل ممتنع کی تعریف میں آتے ہیں تو یہ میر کی خاص قلمرو ہے۔ تاہم غالب کی شاعرانہ عظمت سے انکار کرنا کفر کا مرادف ہے کیونکہ اس کا چیدہ کلام صوری اور معنوی ہر حیثیت سے مجموعہ ہے ان تمام خوبیوں کا۔ جو باستثنائے میر اردو کے مشاہیر شعرا میں فرداً فرداً پائی جاتی ہیں۔ علاوہ بریں اُس کے بیشتر عمدہ اشعار

اور بعض مصرعوں میں اشاریت اس قدر عامۃ الورود ہے کہ ہر شخص کہتا ہے :-

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ایسے اشعار ضرب الامثال بن کر جزوِ زبان ہو گئے ہیں نیز صنعت ترصیع اور برابر کے متقابل مصرعے جتنے غالب کے یہاں ملتے ہیں اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ یہ صنعت فارسی میں عام ہے مگر اردو میں کامیابی سے نباہنے کا سہرا غالب کے سر ہے مثلاً

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا | کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

یہ قاتل وعدہ صبر آزما کیوں | یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

دوسرے مصرع کا ہر لفظ یا فقرہ علی الترتیب پہلے مصرع کے ہر لفظ یا فقرے سے متوازن ہے۔ پہلے شعر میں نام اور کام دوسرے میں صبر آزما اور طاقت ربا ہم قافیہ ہیں۔

تاکہ ہو نگاکے میں بھی شہیدوں میں شامل ہو جاؤں غالب کے بعض اشعار کے جو مطالب سمجھا ہوں عرض کرتا ہوں۔

(۱)

ہے بزمِ بتاں سے سخن آزردہ لبوں سے | تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

شارحین نے دو مطلب بیان کئے ہیں۔ اول یہ کہ خوشامد طلب معشوقوں سے ہم ایسے تنگ آئے ہیں کہ سخن لبوں سے آزردہ ہو گیا ہے گویا اُن کی محفل میں بات چیت کرنے کو بھی ہمارا جی نہیں چاہتا۔

دوم یہ کہ محفلِ معشوق میں سخن لبوں سے رُوٹھ گیا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس کی خوشامد کروں تو لب تک آئے۔ گویا رعبِ حسن سے معشوق کے سامنے بات بھی منھ سے نہیں نکلتی۔

میری گزارش: بھلا یہ کون سی بات ہوئی آپ خوشامد طلب معشوقوں کی محفل میں جاتے بھی ہیں تاہم اُن سے اسی وجہ سے بیزار ہیں اور خوشامد کرنا گوارا نہیں حالانکہ ایسی صورت میں خوشی کی انتہا نہ ہونی چاہیئے۔ ارے صاحب خوشامد کے دریا بہا دیجئے اور بقول داغ۔

باتوں باتوں میں پرچا لیجئے

دوسرے مفہوم کا تناقض بدیہی ہے معشوق کے سامنے رعبِ حسن سے زبان نہیں کھلتی اس وجہ سے سخن لبوں سے خفا ہوگیا ہے اور اس کا متوقع ہے کہ آپ منائیں اور خوشامد کریں تو دوبارہ لبوں سے مانوس و مربوط ہوا ور رعبِ حسن کی مطلق پروا نہ کرے۔

اب میں شعر کا جو مطلب سمجھا ہوں عرض کرتا ہوں، لفظ بت کے دو معنی ہیں ایک تو معشوق دوسرے خاموش۔ غالب نے ان دونوں معنوں کو ذہن میں رکھ کر مضمون پیدا کیا ہے۔ چونکہ بت خاموش رہتے ہیں اور اسی میں اپنا وقار سمجھتے ہیں لہذا اُن کی خوشامد کا بہترین طریقہ یہی ہے اور ان کی خوشنودی اسی میں متصور ہے کہ اُن کے سامنے خاموش بیٹھے رہئے اور بقول ”خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تو ست“ پر کار بند ہوجئے۔ اُدھر عشق ہم کلام ہونے، چاپلوسی کرنے اور عرض نیاز و شرح آرزو کا متمنی، شوق تقاضائے گفتار کرتا ہو مگر بتوں کی مرضی کہ لب آشنائے تکلم نہ ہو منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہو، کیا شوخی ہے سادگی میں کس قدر پرکاری و ستم ظریفی ہے، غالب اکتا کر چیخ اُٹھتے ہیں کہ ہائے ایسے خوشامد طلب معشوق جو خاموشی کے سوا اور کوئی طریق خوشامد پسند نہ کریں اور اس طرح عاشق کو تڑپائیں ترسائیں۔

(۲)

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

قولِ شارحین : ذرہ ایک بے جان چیز ہے لیکن جب آفتاب کا پرتو اس پر پڑتا ہے تو اس میں جان پڑ جاتی ہے چنانچہ سورج کی روشنی میں لاتعداد ذرات ہمیں حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں بالکل اسی طرح تیرے ذوق کی بدولت کائنات میں جان پڑ گئی ہے اور وہ بتقاضائے فطرت ذرات کے مانند تیری طرف دوڑ رہی ہے گویا کائنات کی حیات تیرے پرتو سے ہے ؎

ہے تجلی تری سامانِ وجود　　　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

میں الفاظ ذرہ اور جان کی بلاغت کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ غالب نے ذرہ بصیغہ واحد استعمال کیا ہرچند ذروں دجمع نظم ہو سکتا تھا اور بادی النظر میں وہی مناسب ہوتا ذروں میں جان ہے۔ بات یہ ہے کہ ذرہ بصیغہ واحد لانے سے معنویت میں مہتم بالشان اضافہ ہوا۔ ذاتِ بحث ایسی عظیم و نامحدود و بسیط ہے کہ جملہ کائنات تمام موجودات ارض و سما کا مجموعہ اس کے مقابلہ میں ایک ذرۂ بے مقدار سے زیادہ نہیں۔ ذروں کہنے سے اس مفہوم کا استفادہ نہ ہوتا۔

اب لفظ جان کی بلیغ اشاریت پر غور کیجیے۔ ذات باری قادر و توانا وحی و قیوم ہے اسی کے ارادے کے تابع ہر چیز میں جاندار ہو کہ بے جان توانائی کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے ہر شے کی ایک منزل ہے اور وہ اس منزل کی طرف گرم سفر ہے کیا یہی مسئلہ ارتقا کا خلاصہ نہیں ہے کیا یہی برگساں (BERGSON) کے فلسفے کا لب لباب نہیں ہے :

THERE IS A VITAL SERGE RUNNING THROUGH THE UNIVERSE

کیا اسی میں ATOMIC اور DYNAMIC اور STIATIC THEORIES بند نہیں

ہیں، بظاہر دو معمولی لفظ ذرہ اور جان ہیں جو شعر میں آئے ہیں مگر اس طرفگی سے کہ خیال کی جولانی کے لیے ایک حشر زار پیش کر دیتے ہیں۔

(۳)

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

اس شعر کے مطالب بیان کرنے میں حضرات شارحین پانچ جتھوں میں تقسیم ہو گئے ہیں ایک کہتا ہے کہ اے غافل میں عدم کی منزل سے آگے نکل گیا ہوں۔ جب میرا مقام عدم میں تھا تو جب وہاں میں نے آہِ آتشیں کھینچی تو اس کی آگ سے عنقا کے پر جل گئے۔ شعر میں خوبی یہ ہے عنقا ایک معدوم پرندہ ہے گویا وہ مقامِ عدم میں رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں اس مقام میں تھا تو میری آہِ آتشیں سے عنقا کے پر جل جاتے تھے یعنی فنا فی العدم ہو جانے پر بھی میری آہ میں اس قدر گرمی تھی۔ دوسرا کہتا ہے کہ اپنی نیستی کے بیان میں مبالغہ کیا ہے۔ تیسرا کہتا ہے کہ پہلے میری آہ کا اثر یہ تھا کہ اس سے بالِ عنقا جلتا تھا اور اب تو بالِ عنقا بھی نہیں جلتا گویا پہلے اتنی تاثیر تھی تو اب وہ بھی نہ رہی اور میری بے اثری، بے ثباتی اور نیستی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ عدم سے بھی گزر گئی ہے یا جب عدم میں تھا تو میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جلتا تھا اور بالِ عنقا جلنا بالفاظ دیگر یہ کہ آہِ آتشیں میں کوئی تاثیر نہ تھی۔ چوتھا کہتا ہے کہ میں نے ابتدائے تعلیم فنا میں شہرتِ عنقا کو مٹا دیا تھا جس کو معدوم ہونے کی ایک سب سے زیادہ قوی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ غافل سے وہ لوگ مراد ہیں جو ترقیاتِ انسانی کو نہیں سمجھ سکتے۔ پانچویں کا قول ہے کہ یہ کہنے سے کہ میں عدم سے بھی باہر ہوں یہ حاصل ہوتا ہے کہ میں نہ موجود ہوں نہ معدوم ہوں اور نقیضین مجھ سے مرتفع ہیں۔ شاید ایسے ہی اشعار

پردتی والے کہا کرتے تھے کہ غالب بے معنی شعر کہتے ہیں۔

میں جو کچھ سمجھا ہوں عرض کرتا ہوں۔ عدم ایک اضافی کلمہ RELATIVE TERM ہے، وجود کا مقابل یا نفی وجود یعنی جو چیز پردۂ عدم میں ہے۔ اُس کے وجود میں آنے کا امکان ہے۔ اسی طرح جو چیز موجود ہے اُس کا معدوم ہو جانا ممکن ہے حاصل یہ ہوا کہ ہستی و عدم دونوں اعتباری ہیں۔ عدم سے پرے (باہر) ہو جانے کے بعد اس تقابل تضاد و تعیین ہستی و عدم سے نجات ہو گئی، اس اضافیت (ہست و نیست سے نسبت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب نہ مجھ پر عدم کا حکم لگایا جا سکتا ہے نہ وجود کا، ہر قید و بند سے آزاد ہو گیا۔

عنقا ایک فرضی طائر ہے جو معدوم محض ہے مگر بربنائے تصور ذہنی موجود سمجھا جاتا ہے۔ بقول میر ؎

آوازہ ہی جہاں میں ہمارا سنا کرو عنقا کی طرح زیست ہے اپنی بنام یاں

غالب کہتے ہیں کہ مجھے فنائے کامل حاصل ہو گئی ہے، ایسی فنا جو ماورائے عدم ہے جس کو ہستی سے کوئی علاقہ نہیں جس میں ہستی کی طرف مراجعت کا کوئی امکان نہیں جب تک عدم کی اضافی منزل میں تھا (ایسے عدم میں جس میں ہستی کے نقوش قبول کرنے کی صلاحیت تھی) اس وقت بھی بفیضِ عشق میری آہ میں اتنی تاثیر تھی کہ بال عنقا جلا دیا اس کو ہستی کی طرف پرواز کرنے سے محروم کر دیا۔ اب اُس منزل میں ہوں جو ہستی و عدم کے اطلاق سے بری ہے یعنی فنا فی اللہ ہو گیا۔ یہ مرتبہ جبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ ذات مطلق سے دوری کا احساس اتنا شدید ہو کہ اس کے ماتحت منزل عدم میں بھی آہ کی جائے تو ہستی کی طرف رجعت کے تصور کو یک لخت فنا کر دے۔ اسی کو بال عنقا جلنے سے استعارہ کیا ہے۔ فنا ماورائے فنا یا فنا فی الذات۔ جزو کا کل سے قطرہ کا دریا سے واصل ہو جانا یہی تصوف ہے اور یہی شاعرانہ تفلسف۔

(۴)

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

قولِ شارحین: تسکینِ قلب اسی طرح ہوسکتی ہے کہ تو مل جائے اور ذوقِ نظر سے یہ مطلب ہے کہ تو نہیں تو تیرا ہم شکل مل جائے اور اُس کو دیکھ کر ہمارا ذوقِ نظر پورا ہو جائے تو ہم تسکینِ قلب کا ماتم نہ کریں اور اسی پر قناعت کرلیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ بہشت میں کوئی حور تیری ہم شکل نہیں اس لئے ہم ذوقِ نظر اور تسکینِ قلب دونوں سے محروم ہیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا، ایک جگہ تو کہتے ہیں کہ ہمارا ذوقِ نظر پورا ہو جائے یعنی ذوقِ نظر موجود ہے اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ہم ذوقِ نظر سے محروم ہیں۔

اب میں جو کچھ سمجھا ہوں عرض کرتا ہوں: عام عقیدہ ہے کہ بہشت وہ مقام ہے جہاں سکونِ قلب نصیب ہوگا مکمل طمانیت ہوگی، غالب کہتے ہیں، ہم تو خوش ہونے کے بجائے ایسی تسکین کی جان کو روئیں گے ہمیں ایک آنکھ نہ بھائے گی۔ ہاں ایک صورت ہے کہ تسکین گوارا ہوسکتی ہے، ذوقِ نظر یعنی نظر بازی کا لپکا بھی برقرار رہے۔ پھر کہتے ہیں نہ ایسا ہونے پر بھی تسکین مشتبہ ہے۔ جب تک حورانِ بہشتی جن سے آنکھیں لڑائی جائیں گی تیری ہم شکل نہ ہوں۔ ہم اُن لوگوں میں نہیں، جو ہئی یاری جوڑتے پھریں۔ حاصل یہ ہوا کہ بہشت ہمارے لئے جبھی بہشت ہے کہ وہاں بھی ذوقِ نظر ملے اور اسی کے ساتھ سامان نظارہ بھی مہیا ہو یعنی جس سے اس دنیا میں لگن لگی تھی وہ بھی بہشت میں موجود ہو اور وہ نہ ہو تو اس کی ہم شکل کرشمہ طراز و عشوہ پرداز حوریں ہوں۔ ایسی جنت ہماری گوں کی نہیں جو

"کسے را با کسے کارے نباشد"

کی مصداق ہے۔ جہاں حور طلبِ بوسہ پر ٹھینگا نہیں دکھاتی یا قابو میں آکر جھوٹی قسمیں

کھا کھا کر آغوش سے مچل کر نکل نہیں جاتی اور پھر منہ نہیں چڑاتی۔

دیگر شارحین کے اور میرے بیان کردہ مطلب میں خاص فرق یہ ہے کہ وہ بہشت میں داخلے کے بعد کی باتیں ہیں (یہ جملہ کہ "اس لئے ہم ذوقِ نظر اور تسکینِ قلب دونوں سے محروم ہیں" اس کا غماز ہے) اور میرے نزدیک غالب اسی دنیا میں بہشت کی مجہول یا معطل زندگی پر تبصرہ کر رہے ہیں جس میں معشوق سے تخاطب اور چھیڑ چھاڑنے اور بھی مزا بھر دیا ہے۔

(۵)

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

بقول آغا محمد باقر صاحب (اقوال شارحین کے لئے میں انھیں کی تالیف "بیان غالب" کا منت گزار ہوں)، تمام شارحین نے باستثنا آسی اس شعر کا یہ مطلب بیان کیا ہے۔

"اگر غیر کو تم سے محبت ہے تو یوں ہی سہی۔ ہم بھی اپنے دشمن نہیں ہیں کہ یہ بات جانتے ہوئے تمہارے عشق کے دکھ اور رشک کی تکلیف برداشت کریں۔"

شارحینِ عظام کو یہ اضافہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی کہ لہذا تمہارے عشق سے دست بردار ہوتے ہیں جو لازمی نتیجہ ہے یہ کہنے کا کہ ہم بھی اپنے دشمن نہیں کہ تمہارے عشق کے دکھ اور رشک کی تکلیف برداشت کریں۔ معروضہ ٹکڑا اضافہ کرتے تو واضح ہو جاتا کہ یہ عشق تو نہ ہوا موم کی ناک ہوئی۔ اس سے قطع نظر کہ لفظ غیر میں یہ مفہوم مضمر ہے کہ وہ معشوق کو چاہنے میں غالب کا حریف ہے اور اس کا عشق غالب سے پوشیدہ نہیں نیز اس واقعہ سے پہلے ہی جس کا شعر میں ذکر ہے غالب کو اس رقابت کا علم ہے پھر یہ تمام ہنگامہ کیوں برپا ہو گیا۔ ایسا بودا اور پادر ہوا خیال غالب سے کیسا کسی معمولی شاعر سے بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

آسی کی شرح یہ ہے:

"الفاظ ہی اور یہی اس کے شاہد ہیں کہ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے تو یہی ہم بھی جانتے ہیں مگر ہم بھی تو دشمن نہیں ہیں ہم بھی تو اپنے ہی ہیں ہم کو بھی تجھ سے محبت ہے پھر ہم کو اس کے مقابلے پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے"

یہ شرح بھی ناقص اور لایعنی ہے۔ اگر غالب یہی کہنا چاہتے کہ ہم بھی دشمن نہیں ہم بھی تو اپنے ہی ہیں تو مصرع اولیٰ اس طرح بآسانی موزوں کر سکتے تھے:

"ہم بھی دشمن تو نہیں، اپنے ہیں"

بجائے

"ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے"

جس کا مطلب اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم بھی اپنے (اپنی جان کے) دشمن نہیں ہیں علاوہ بریں اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں کہ "غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی" کے یہ معنی لئے جائیں کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے تو یہی۔ اب میری گزارشیں سنئے۔ شعر کا پس منظر یہ ہے کہ معشوق غالب کی موجودگی میں اور ان کو سنا کر کہتا ہے کہ غیر کو مجھ سے محبت ہے۔ یہ امر (غیر کی محبت) ایسا بدیہی ہے کہ معشوق کے مزاج داں غالب چونکتا ہوتے اور سوچتے ہیں کہ اس بظاہر سادہ (غیر متعلق) بیان کی تہہ میں کوئی نہ کوئی فریب ضرور ہے، کوئی چال چلا ہے۔ غور کرنے سے انکشاف ہوتا ہے کہ اس سادگی میں غضب کی پُرکاری ہے اور بات بہت دور پہنچتی ہے معشوق کا یہ قول محض ستانے یا جلانے کے لئے نہیں ہے بلکہ طرف عاشق کی آزمائش ہے، یہ جُل دینا چاہتا ہے کہ میں بھی جل کر اور مشتعل ہو کر ادعائے عشق کردں اور ایسے فعل کا مرتکب ہوں جو خلاف شیوۂ عاشقی ہے کیونکہ معشوق سے بالاعلان عشق جتانا بوالہوسی کا مرادف ہے۔ عشق اگر صادق ہے تو دل کی خبر دل کو ہوتی ہے خود بقول غالب

پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

فارسی کا شاعر کہتا ہے:

میانِ عاشق و معشوق رمزیست   کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

میر تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ اظہار محبت کا کفارہ جاں سپاری کے سوا کچھ نہیں۔

میرا اظہار محبت میں گیا جی نہ ترا   ہائے نادان بہت تو نے چھپایا ہوتا

غالب پر معشوق کا مافی الضمیر تو روشن ہو گیا اب دوسری مہم درپیش ہوئی کہ جواب کیا دیا جائے خاموش رہتے ہیں تو حامہ جوابی ہی پر حرف نہیں آتا بلکہ نکتہ چیں معشوق آگ بگولا ہو کر یہ کہے گا کہ اس کی بات کو ناقابل اعتنا سمجھے۔ اس کان سنا اس کان اڑا دیا۔ کھلا کھلا جواب دینا آداب عشق و شانِ حسن دونوں کے منافی ہے۔ جواب ویسا ہی مبہم ہو جیسی معشوق کی بات تھی ترکی بہ ترکی ہو۔ لہذا صرف اتنا کہتے ہیں کہ "ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے"۔ جواب کی اہمیت اور بلاغت شعر کی ردیف "ہی سہی" میں گرہ ہے۔ اس نے غیر کے قول کی تکذیب کر دی اور اس کی محبت کو مشتبہ بنا دیا۔ "غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی" کا یہ مطلب ہوا کہ ہمیں یقین نہیں کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے مگر یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ اس کو تجھ سے محبت ہے

اس طرح وہ پہلو نکل آیا جس پر میں زور دے رہا تھا غیر عاشق نہیں بلکہ بوالہوس ہے ورنہ اعلان محبت یا اقرار محبت نہ کرتا اسی کے ساتھ معشوق پر یہ چھینٹا آ گیا کہ تو ایسا سادہ لوح ہے کہ اس کی بات کا یقین آ گیا، یہی نہیں بلکہ مجھ سے بھی متوقع ہے کہ غیر پر رشک کروں اور جینے سے بیزار ہو جاؤں یا اسی کی طرح بے غیرت بن کر تجھ سے محبت جتاؤں تاکہ اسی طرح تیری نظر میں ذلیل ہو جاؤں تو صاحب میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں نہ میں غیر کی طرح تنگ ظرف ہوں ضمناً یہ پہلو بھی نکل آیا کہ میرے عشق میں غیر کے علی الرغم خلوص ہے۔ نیز یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ تجھے بھی غیر کی محبت کے بلے لوٹ ہونے کا

یقین نہیں ورنہ مجھ سے چھپاتا اس شعر میں غالب مومن سے بہت قریب ہو گئے ہیں معشوق سے ایسی چلی کٹی جس میں راز و نیاز کا پہلو نکلے اُن کے یہاں بہت ہے

(۶)

شاید کہ مر گیا تیرے رخسار دیکھ کر　　پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا (از نسخہ حمیدیہ)

مصنف "غالب نامہ" باوجودیکہ غالب کے بڑے مداح ہیں اس کے متعلق منجملہ دیگر اشعار کے جن کا تعلق غالب کے ابتدائی دورِ شاعری سے ہے یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس کی بنیاد محض رعایتِ لفظی پر ہے اور حسنِ معنی سے بالکل عاری ہے دراں حالے کہ مجکو یہ شعر الہامی معلوم ہوتا ہے۔ پہلے چاند کے متعلق چند سائنٹفک انکشافات کا ذکر کردوں۔

عام طور پر آج تک یہ عقیدہ ہے کہ چاند میں جاندار مخلوق اور دریا اور چشمے ہیں مگر سائنس دانوں کی تحقیق ہے کہ چاند میں ہوا یا پانی موجود ہونے کے کوئی قرائن نہیں پائے جاتے لہذا اُس میں حیات کا وجود ممکن نہیں۔ نیز یہ کہ چاند مہر سے براہ راست کسبِ ضیا نہیں کرتا بلکہ اُس میں نور کے غار FISSURES OR CRATERS OF LIGHT ہیں جن کے گرد قریب قریب مدوّر اور اُبھرے ہوئے حلقے (RING) ہیں جو مہر کی شعاعوں کو انجذاب کے بعد منعکس کرتے ہیں اور اس طرح پورا سطح منور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ چودھویں کے چاند میں نہ صرف روشنی کا حجم زیادہ ہوتا ہے بلکہ تابندگی بھی شدید تر ہوتی ہے کیونکہ اس رات سورج کی کرنیں اُس تک عمودی شکل میں پہنچتی ہیں۔ بعدازاں روشنی کا زوال شروع ہوتا ہے FISSURES OR CRATERS OF LIGHT کی بنیاد پر سر اقبال مرحوم نے یہ شعر کہا جو بالِ جبریل میں درج ہے۔

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر　　کر دے تو اسے چاند کے غاروں میں نظر بند

نمائیاً ۱۹۳۵ء میں اس شعر پر اعتراض ہوا تھا اور میں نے جواب دیا تھا۔ جو اپنے مطبوعہ "تنقیدی مضامین" سے نقل کرتا ہوں :-

"۱۸۶۰ء کے لگ بھگ ایک جرمن سائنس داں زیگلر (ZEIGLER) نے دریافت کیا کہ چاند کی سطح براہ راست روشن نہیں ہے بلکہ اس میں غار ہیں اور ان غاروں سے روشنی نکلتی پھیلتی اور پورے سطح کو منور کرتی ہے۔ انگریزی میں ان غاروں کو FISSURES OF LIGHT کہتے ہیں جس کا لفظی ترجمہ نور کے غار ہوا اب اقبال کا شعر دوبارہ پڑھیئے ؛

مدت سے ہے آوارۂ افلاک مرا فکر   کردے تو اسے چاند کے غاروں میں نظر بند

تاکہ میری فکر (میں میرا فکر نہیں کہہ سکتا) وہاں سے ایک لمعۂ نور بن کر نکل آئے اور تاریکی شب (لوگوں کی جہالت) دور کردے۔"

ظن غالب یہی ہے کہ غالب کو ان مسائل کا علم نہ تھا اور انھوں نے اپنے شعر کی بنیاد رخسار معشوق اور چاند (ماہِ کامل) کی تشبیہ پر بشمول محاورۂ پیمانہ لبریز ہونا یعنی زندگی ختم ہونے پر رکھی مگر ان امور کی روشنی میں جو میں نے بیان کئے تخیل حقیقت کے پیکر میں ڈھل گئی اور اب محض برنبائے محاورہ ہی پیمانہ ماہ کا لبریز نور ہو کر مرنا نہیں رہ گیا بلکہ دراصل ماہ کامل کا پیمانہ لبریز نور ہوتا ہے اور چاند کا مرنا خالی خولی تخیل کی کارفرمائی نہیں بلکہ چاند فی نفسہٖ زندگی یعنی زندہ مخلوق سے خالی ہے۔

تو صاحب غصہ کیوں نہ آئے جب کلامِ غالب کے نکات ولطائف آشکار کرنے کے باوصف غالب پرست مجھے اپنا ہم پیشہ وہم مشرب وہمراز نہ سمجھیں بلکہ اس کی منقصت سے متہم کریں اور صرف اس بنا پر کہ میں خود غالب اور ناسخ کی طرح یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ کسی گہرے اور اہم عیب کا دریافت کرنا ہی اُس مقام تک پہنچا دیتا ہے جہاں کلام کی اعلیٰ خوبیاں ہوتی ہیں بشرطیکہ صحیح معنوں میں خوبیاں ہوں۔ میں بالا رو و رعایت اسی پر عامل رہتا ہوں اور کم سے کم سعی یہی ہوتی ہے۔

(۷)

داغِ دل بے درد نظرگاہِ حیا ہے ۔۔۔ شبنم پہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے

دلِ بے درد۔ اس کے معنی ظالم کا دل نہ لینا چاہیے بلکہ ایسا دل جو درد سے خالی ہے جس میں درد موجود نہیں ہے۔ نظرگاہِ حیا جس پر حیا کی نظر پڑے (شرم کا باعث) مطلب گلِ لالہ یوں ہی خوبصورت ہوتا ہے، قطراتِ شبنم سے اس کا حسن اور بھی نکھر گیا۔ رعنائی بڑھ گئی۔ گل لالہ و دل عاشق میں داغ مشترک ہے۔ شاعر یا عاشق کو رشک ہوا کہ میرے دل میں داغ تو ہے مگر اس پر شبنم کے قطروں کی ٹلک نہیں۔ یہ ایک امتیازی شان گل لالہ میں معلوم ہوئی لیکن فوراً متنبہ ہوا کہ یہ اوس کی بوندیں نہیں عرق انفعال ہے۔ لالہ کا داغ نمائشی ہے کیونکہ گل لالہ کسی پر عاشق نہیں۔ اُس کو احساس ہے کہ میرے دل میں داغ تو ہے جو علامت عشق ہے مگر دل درد سے خالی ہے۔ لالہ کے داغ دل میں وہ سوز و گداز کہاں جو دلِ عاشق میں ہے یہاں اضطراب و التہاب ہے۔ داغِ دلِ لالہ اس قدر خنک کہ قطراتِ شبنم قائم ہیں۔ داغِ لالہ نمایاں، داغِ دل عاشق پنہاں، ایک نمائش پر مائل، دوسرے کو اخفا میں کاوش، داغِ لالہ تاریک، داغِ دل رشکِ خورشید۔ عاشق کو داغِ لالہ کی لطافت اور خوش نمائی نے رشک پر اُبھارا تھا کہ میرا دل داغدار ان خوبیوں سے محروم ہے مگر جب اس ظاہری حسن کاری کی حقیقت آئینہ ہوئی تو اپنی کوتاہ نگاہی

پر متنبہ ہوا اور اپنی قسمت پر فخر کیا کہ مجھے نہ صرف دلِ داغدار بلکہ دلِ دردمند عطا ہوا جس کے مقابل گلِ لالہ جس کی خوبصورتی زبان زد ہے اور جس کے حسن کو شبنم کے قطرے دوبالا کر رہے ہیں بے وقعت ہے۔

شبنم اور حیا میں عرق نا کی وجہ شبہ موجود ہے۔ جو ذہن کو شبنم سے حیا کی طرف منتقل کر تی ہے۔

(۸)

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

قولِ شارحین (۱) ہمارا دل کشمکشِ حسرتِ دیدار سے خون ہو کر اس بتِ بدمستِ حنا کے ہاتھ کا شیشہ بن گیا ہے (۲) معشوق کے ہاتھ میں آئینہ حنا بنا ہوا ہے کہ کسی وقت چھوٹتا ہی نہیں اور ادھر حسرتِ دیدار کی کشمکش سے ہمارا دل خون ہو رہا ہے اس لئے کہ اس کے چہرے کو دیکھیں تو کس طرح دیکھیں یہ آئینہ بیچ میں حائل ہے (۳) آئینۂ دل مہندی بن گیا ہے یعنی حسرتِ دیدار نے اسے پیس ڈالا اور اس کے جگر کو لہو کر دیا۔ دل کو آئینہ بنا کر پھر اسے حنا بنا دینا بہت ہی تصنع ہے (۴) دل اور آئینے کی رسائی قسمت کا مقابلہ کیا ہے۔ ایک ہمارا دل ہے جو خوں شدۂ کشمکش حسرتِ دیدار ہے اور ایک آئینہ ہے جو اس بتِ بدمستِ حنا کے ہاتھ میں ہے (۵) میرا دلِ حیران جو آئینہ اس لئے بنا تھا کہ معشوق اسے دیکھے اور اس صورت سے وہ معشوق کا نظارہ کرے وہ حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا مگر اس تک نہ پہنچا اور کمبخت حنا اس کے ہاتھ میں آئینہ بنی ہوئی ہے (۶) میرا دل جو حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا تھا وہ صورتِ آئینہ حنا بن کر اس کے دستِ نازک میں پہنچا ہے۔

عرضِ اثر: اس شعر میں بھی تعقید ہے۔ اس کی نثر یوں ہو گی: حنا بدستِ بتِ بدمست

آئینہ ہے (آئینہ بطور محاورہ صرف ہوا ہے۔ عیاں کرتا ہے) (کاہے کا آئینہ ہے؟) (کہ)

دل خون شدہ کش مکشِ حسرتِ دیدار (ہے)

مطلب معشوق کے ہاتھوں کا رنگ حنا (سُرخ) اُس پر میرے دل کا حال آئینہ عیاں کر رہا ہے کہ جس طرح اُس کے ہاتھ مہندی ملنے سے سُرخ ہو گئے اُسی طرح میرا دل کش مکش حسرتِ دیدار میں مبتلا ہے، پس رہا ہے، خون ہو رہا ہے تاہم وہ اپنے مہندی لگے ہاتھوں کے نظارے میں ایسا محو ہے، مست ہے کہ میرے حال سے بے خبر ہے۔

(۹)

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ　　　　اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

خود غالب نے حالی کو اس شعر کے یہ معنی بتائے

"اگر "اے" کے بدلے "جز" پڑھا جائے تو شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سوائے نالہ کے جگر سوختہ (عشق) کا کوئی نشان نہیں، چنانچہ قمری اور بلبل کے عاشق ہونے کا نشان بھی صرف اُن کی نالہ کشی سے ملتا ہے ورنہ قمری ایک کفِ خاکستر ہے اپنے خاکی رنگ کی وجہ سے اور بلبل قفسِ رنگ ہے اپنے رنگین پروں کی بدولت۔
گویا ان کی ہستی کفِ خاکستر اور قفسِ رنگ سے زیادہ نہیں۔"

عرضِ آثمہ: کوئی لغت اور کوئی محاورہ غالب کا ہمنوا نہیں کہ "اے" کے معنی "جز" ہیں اب میری سمجھ میں جو مطلب آیا ہے بیان کرتا ہوں۔ نالے میں سوز و التہاب ہوتا ہے اور اُس کا کام جلانا ہے۔ قمری سرو کے عشق میں اور بلبل گل کے عشق میں نالہ کش ہوئی دونوں فنا ہو گئیں، ایک کی یادگار کفِ خاکستر رہ گئی۔ دوسری قفسِ رنگ بن گئی موہوم اور غیر مرئی۔ تاہم کچھ نہ کچھ نشان باقی رہا۔ شاعر کہتا ہے کہ میں نالہ کش ہوا تو جگر ایسا جلا کہ

خفیف سا نشان بھی باقی نہیں گیا ہے" استفہامِ انکاری ہے یعنی کوئی نشان نہیں. نالہ سے خطاب اس لئے ہے کہ وہی جلائے کا سبب ہوا لہذا اُس کو معلوم ہونا چاہیئے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ جلنے کے بعد کسی چیز کے لطیف اجزا ہوا یا فضا میں تحلیل ہو جاتے ہیں صرف کثیف حصہ باقی رہ جاتا ہے. شعر میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کے عشق کو قمری اور بلبل کے عشق پر فضیلت ہے قمری کے عشق میں بھی ایک جز و کثیف تھا وہ چٹکی بھر راکھ بھی بلبل کا عشق بھی ناقص تھا کیونکہ مکمل طور پر فنا ہونے کے بدلے ایک "قفس رنگ" کا شائبہ رہ گیا. شاعر کہتا ہے میں نے اپنے محبوب کے فراق میں نالہ کیا جس نے جگر کو ایسا جلایا کہ اُس کا نشان تک باقی نہ رہا. اگر کوئی کثیف جزو ہوتا تو باقی رہتا. فارسی میں زندان رنگ چمن سے اور قفس رنگ گل سے استعارہ ہے. افسوس کہ اس وقت کوئی شعر سند میں یاد نہیں آتا. مگر مجھے یقین ہے کہ اہل نظر میرے قول کی تصدیق کریں گے۔

(۱۰)

جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے　　　　شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی

مولانا نظم طباطبائی کی شرح یہ ہے:

> ہوسِ شعلہ نے جو بات کی وہ شعلے سے بھی نہ ہوتی کہ جی کو جلا ہی دیا. جی جلنا اردو کے محاورے میں ناگوار ہونے کے معنی پر ہے، یہاں یہ مقصد نہیں ہے بلکہ جی جلنے سے کڑھنا مقصود ہے اور یہ مصنف نے اپنی عادت کے موافق دل سوختن کا ترجمہ کر لیا. فارسی میں کہیں گے بر بیکسیش دلم میں سوزد لیکن اردو میں یہ کہنا کہ اُس کی بے کسی پر دل جلتا ہے اچھا نہیں ہے. افسردگیٔ دل سے اُس کا شعلۂ عشق سے خالی ہونا مراد ہے۔

ناگوار ہونے کے ہیں۔

عرض آثم: مولانا کا یہ فرمانا درست ہے کہ اُردو میں جی جلنا کے معنی ناگوار ہونے کے ہیں۔ نیز رشک یا غصہ دلانا بھی ہیں جس کو انگریزی میں TO INFLAME کہتے ہیں (بحوالہ فیلن) سوال یہ ہے کہ غالب نے جی جلنا اپنے شعر میں کس معنی میں استعمال کیا ہے بطور محاورہ اُردو یا بشکل ترجمۂ فارسی میری رائے میں محاورہ ہی نظم کیا ہے۔ انھیں دل کی افسردگی پر غصہ آرہا ہے (نہ کہ دل کی افسردگی کا تاسف ہے) کہ اسی کے شعلۂ اضطراب کو اپنا خرمن پھونکنا تھا مگر اس سے تو یہ کام ہوا نہیں بلکہ غیر متوقع طور پر اس کی خواہش یا ہوسِ التہاب نے وہ سامان مہیا کر دیا، ایسی صورت میں دل کڑھے گا یا غصہ آئے گا؟ دل کی یہ حالت، ناگوار ہوگی یا اُس سے ہمدردی پیدا ہوگی؟ مزید وضاحت کے لئے شعر دوبارہ پڑھئے دل شعلۂ عشق سے اس طرح نہ جلتا جس طرح اس شعلے کی حسرت یا ہوس سے چپکے چپکے جل گیا شاعر کو دل کے اس طرح جلنے پر غم و غصہ ہے (جس میں ناگوار ہونے کا مفہوم مضمر ہے) اور کہتا ہے کاش یہ دل پژمردہ و افسردہ اتنی ہمت رکھتا ہوتا کہ شعلۂ عشق فروزاں کر کے بے محابا جل جاتا نہ کہ ہوس شعلہ میں (ہوس میں بھی گرمی اور التہاب بالخاصہ موجود ہے) اندر ہی اندر سلگ کر خاک ہو گیا۔ اس میں کڑھنے کا کیا دخل؟ غالب کے مندرجہ ذیل اشعار لیجئے:۔

(۱) جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں — ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

(۲) میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل — دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

ان اشعار میں غم و غصہ اور ناگوار ہونے کے سوا کوئی گوشہ نہیں نکلتا۔

(۱۱)

دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

قول شارحین: (۱) دنیا میں لفظ وفا استعمال تو بہت کیا جاتا ہے لیکن کبھی اصل معنوں

میں استعمال نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اس بے معنی استعمال اور خالی ذکرِ وفا سے عاشق صادق کی تسلیِ خاطر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ وہ لفظ ہے کہ جس کو کبھی اپنے معانی کا شرمندہ احسان نہ ہونا پڑا۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ جب دنیا میں اصلی وفا نہیں تو صرف نقشِ وفا سے تسلیِ خاطر کیونکر ہو سکتی ہے (۲)، جو لوگ وفاداری سے نقشِ وفا قائم کرتے ہیں وہ اپنا وقت بیکار ضائع کرتے ہیں۔ اس لئے نقشِ وفا اہلِ وفا کے لئے موجب تسلی خاطر نہیں ہوتا بعینہٖ اہلِ وفا دستورِ دنیا کے مطابق جفا کے مستحق قرار دیئے جاتے ہیں شاعر مصرعۂ ثانی سے اپنے دل کو تسلی دیتا ہے (۳) لوگ دنیا میں وفا کر کے تسلی چاہتے ہیں جب وفا کر کے تسلی نہ ہوئی تو لفظ وفا بے معنی رہ گیا حاصل یہ کہ وفاداریِ عشاق بے معنی بات ہے (۴) غالب نے پہلے وفا کو نقش (تعویذ کے معنوں پر) کہا اور کہا کہ اس سے کبھی تسلی نہ ہوئی۔ دوسرے مصرع میں اسے لفظ بے معنی کہا یعنی کوئی وفادار نہ نکلا جس پر اس لفظ کا صحیح اطلاق ہوتا۔

عرضِ اثر: اگر شعر کا حاصل یہی ہے تو کس قدر خوبصورت الفاظ کیسے لچر مضمون پر صرف کئے گئے۔ تمام اہلِ وفا اور ان کی جاں کا ہیاں حرفِ غلط ہو گئیں کوئی مردِ میدانِ وفا نہ رہا۔ میں شعر کا جو مطلب سمجھا ہوں یہ ہے کہ وفا ایسی چیز ہے جس کا دنیا میں کوئی قدر شناس نہیں گویا ایک لفظ بے معنی ہے جس کا مفہوم یا حاصل کوئی نہیں سمجھتا تاہم اہلِ وفا اپنی دھن کے پکے اور راہِ وفا میں ثابت قدم ہیں وفا کا صلہ نہیں چاہتے صرف اس کی پذیرائی سے تسلی ہو سکتی مگر اس سے بھی محروم ہیں۔ اندازِ بیان نے یہ خوبی پیدا کی کہ کسی کو الزام نہیں دیتے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ شاید لفظِ وفا بے معنی ہے کوئی سمجھتا ہی نہیں قدر کیا کرے۔

(۱۲)

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی ۔۔۔ جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

قول شارحین: (۱) اے ساقی ہر شخص کو بقدرِ حوصلہ تشنہ کامی ہوا کرتی ہے مگر میرا

ظرف بہت بڑا ہے، حد یہ ہے کہ دریائے شراب بھی مجھے سیر نہیں کر سکتا۔ بس یوں سمجھ لے کہ اگر تو دریائے شراب ہے تو میں اس دریائے شراب کا ساحل ہوں اور ساحل (کی) خاصیت یہ ہے کہ باوجود نزدیکی و فیاضیٔ دریا کے کبھی سیر نہیں ہوتا بلکہ ٹیڑھا ہو ہو کر انگڑائیاں ہی لیا کرتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہے اور اسے اور شراب کی ضرورت ہے۔ اس لئے اگر تو بافراط شراب پلا سکتا ہے تو میں بھی ساحل ہوں۔ گویا میرا ظرف تیری دریا دلی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے (۲)، یا یہ کہ جس قدر تیرا حوصلہ شراب پلانے میں بڑھا ہوا ہے اسی قدر میرا ظرف بھی بڑا ہے۔

عرضِ اثر: علی سرہندی کا شعر ہے ؎

تو چوں ساقی شوی در دِ تنک ظرفی نمی ماند بقدرِ بحر باشد وسعتِ آغوشِ ساحلہا

اس میں خاص بات یہ ہے کہ ساقی کی ایک نگاہ تنک ظرف کو بھی عالی ظرف بنا دیتی ہے اس کو ایک برجستہ مثال سے ثابت کیا ہے؛

بقدرِ بحر باشد وسعتِ آغوشِ ساحلہا

غالب کے شعر میں یہ نکتہ نہیں ہے باقی وہی ہے جو علی سرہندی نے کہا ہے وہ لفظوں کو پیچ دے کر کہتے ہیں کہ اے ساقی میں جس طرح پینے میں عالی ظرف تھا دیسا ہی تشنہ کامی میں بھی ہوں (اشارحین نے بھی کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا) جب میرے ذوقِ مے کشی کی انتہا نہیں تھی اب خمارِ تشنہ کامی کی تھاہ نہیں جس حد کا ذوقِ مے کشی تھا اسی حد پر تشنہ کامی بھی ہے۔ یہ جملہ محذوف ہے: کہ اگر یقین نہ ہو تو پلا کے دیکھ لے کہ تیری دریا دلی کے ساتھ میری تشنگی بڑھتی جائے گی ساحل کی خشکی اور تشنہ لبی مسلمات شاعری میں سے ہیں۔

عجب نہیں کہ غالب نے اپنے شعر کا مضمون علی سرہندی کے نقل کردہ شعر سے

اخذ کیا ہو۔

(۱۳)

ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں — کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

ایک صاحب نے غالب کے اس شعر کا موازنہ نظیری کے مندرجہ ذیل مطلع سے

بزیرِ ہر بُنِ مو چشمِ روشنیست مرا — بروشنائی ہر ذرہ روزنیست مرا

ان الفاظ میں کیا ہے :-

اس شعر میں وہ بات نہیں جو غالب کے شعر میں ہے۔ نظیری ابھی اس مقام میں ہیں جہاں اُن کو ہر شے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے اور اس کو منتہائے معرفت سمجھ رہے ہیں۔ نظیری کے اس شعر میں جو کچھ بھی ہے وہ غالب کے صرف دوسرے مصرع کا مضمون ہے۔ پہلا مصرع "ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں" پردے کا پورا راز کہہ رہا ہے اور یہ وہ مقام ہے جو نظیری کے مقام سے بلند ہے اور صاف کیوں نہ کہہ دوں کہ یہ وہ مقام ہے کہ صاحب معراج حضرت خاتم الانبیاء جس کے سالک ہیں اور یہ ترانہ "ما عرفناک حق معرفتک" ہے۔ اس سے زیادہ بلند مقام تک پہنچنے میں پرواز بشر شکستہ پر ہے۔ اس مصرعہ میں دو ٹکڑے نہایت بلیغ رکھ دیے ہیں محرمی اور ترستا ہوں۔ محرم کے معنی جس سے پردہ نہ ہو اور ترستا ہوں کا مفہوم یہ ہے کہ حد کی آرزو ہے اور قطعاً محروم ہوں۔

عرض اثر : یہ دعویٰ کہ جو کچھ نظیری کے شعر میں ہے وہ غالب کے دوسرے مصرع میں ہے حقیقت کے خلاف ہے۔ ع

کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

اور بذرہ ذرہ ہر بُنِ مو چشم روشنیست مرا

کیا غالب کا مصرعہ نظیری کے مصرع کا ناقص ترجمہ نہیں ہے؟ ناقص اس لئے کہ غالب نے بُن مو کو چشم بینا کہدیا اور نظیری نے بذرہ ہر بُن مو کہہ کر چشم روشن کو ایک پلک سے بھی درست کر دیا۔ خیر اسے جانے دیجئے۔ جہاں تک ان دونوں مصرعوں کا تعلق ہے غالب اور نظیری کے اشعار متحد المفہوم ہیں۔ یہاں غالب نامحرمیٔ حسن کا اعتراف کر کے ٹھہر جاتے ہیں لیکن نظیری شوق نظارہ کے ساتھ کثرتِ جلوہ کا سامان مہیا کرتا ہے۔ روزن کسی مکان میں ہوتا ہے۔ اس حریم قدس کی وسعت کا کیا ٹھکانا ہے جس میں ہر ذرہ ایک روزن کا کام دے۔ نیز اس شوق کی کیا انتہا ہے کہ ہر بُنِ مو چشم روشن بن جائے۔ چونکہ ہر ذرہ کو تابندہ کہا اور روزن سے استعارہ کیا لہذا معلوم ہوا کہ نور ہنوز ہر ذرے کے روزن سے چھن چھن کے مشتاقوں کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ یہ روزن بے شمار اور عشق کا تقاضا کہ ہمہ تن چشم ہو بن کر ہر روزن سے گل چینیٔ جمال کرو جو ناممکن ہے لہذا شوق بدستور تشنہ رہتا ہے ضمناً یہ بات بھی نکل آئی کہ حسن کی مکمل معرفت محال ہے اسی گوشے کو نظیری کا مصرعہ مستعار لے کر غالب نے اپنے شعر کی کائنات بنایا تاہم نظیری کی منقصت کی جاتی ہے اور غالب کو بڑھایا چڑھایا جاتا ہے خدا کی قدرت ہے اور کیا کہا جائے

(۱۴)

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

یہی بزرگ غالب کے اس شعر کا نظیری کے اس شعر سے :

زفرق تا قدمش ہر کجا نظر فگنم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

موازنہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ نظیری نے جو کچھ اس مصرع میں کہا ہے :

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

وہ سب غالب نے "بلائے جان" کے ٹکڑے میں بھر دیا ہے ۔ زورِ کلام مستزاد براں کوئی پوچھے کہ : کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

کا جواب فارسی میں بھی کہیں ہے اردو کا تو ذکر کیا ۔

(۱۵)

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

انھیں بزرگ نے غالب کے شعر کا موازنہ ملا غنیمت کے اس شعر سے کیا ہے :

ز مہر ش سینہ ہا جولاں گہ برق دلِ ہر ذرہ در جوش انا الشرق

فرماتے ہیں کہ :

ہر قطرے کا دل ایک ساز ہے جس سے انا البحر کے نغمے نکلتے ہیں یعنی قطرے کا دل چیر کر دیکھنے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ ساز کی طرح نغمہ ریزی کر رہا ہے کہ میں بحر ہوں ۔ یہاں تک مرزا نے جو کچھ کہا ہے اس میں ملا غنیمت کے دونوں مصرعوں سے زیادہ مضمون ہے ۔ اس پر اور زیادہ ترقی کی گئی ہے اور فرمایا ہے کہ ہم کو چشمِ کم سے نہ دیکھنا ، ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا اور اتنا ہی نہیں کہ غالب صرف اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہو بلکہ اُسے اس پر ناز بھی ہے اور دوسرے مصرع میں جو اترانے کی شان نکلتی ہے وہ بھی اہلِ ذوق سے کچھ کہتی ہے ۔

متصوفانہ رنگ : ہم سے یہاں ماسوی مراد ہے یعنی کسی ذلیل سی ذلیل

چیز کو حقارت کی نظر سے : دیکھو اس لئے کہ تعینات کا پردہ اُٹھ جائے ہر شئے بلکہ ہر ذرہ وہی ہے۔

ایک نازک فرق دونوں شعروں میں یہ بھی ہے کہ ملا غنیمت نے مہر (محبت یا دہر خدا) کی قید لگا دی ہے یعنی اُس کی محبت یا اُس کے جلوے کے صدقے میں ہر ذرہ انا الشرق کا دعویٰ کرتا ہے غالب کوئی قید نہیں لگاتے اور فرماتے ہیں کہ حقیقت ہی یہ ہے کہ ہر شئے وہی ہے اور تصوف سے قطع نظر کر لی جائے تو بھی یہ قول اظہر من الشمس ہے۔ اس لئے کہ جب ہر شئے کا ظہور اسی کی قدرت سے ہے اور ہر شئے سے اُسی کی ہستی نظر آتی ہے تو کسی قید کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وسعت مضمون کے اعتبار سے غنیمت کے شعر کو غالب کے شعر سے کوئی نسبت نہیں...... غنیمت نے در جوش انا الشرق کہا (میں آفتاب ہوں)، غالب نے انا البحر کہا یعنی میں خود سمندر ہوں۔ دل کا لفظ باطن کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

متصوفانہ رنگ : ایک باریک فرق یہ بھی ہے کہ مرزا کا پہلا مصرع حقیقت یعنی عینیت کے چہرے سے نقاب اُٹھاتا ہے اور دوسرا مقام ظہور ہے"

عرضِ اثمر: غالب اور غنیمت دونوں نے مسئلہ وحدت الوجود نظم کیا ہے۔ ایک نے تمثیل کے لئے قطرہ و بحر، دوسرے نے ذرہ و آفتاب انتخاب کئے۔ یہ فرمانا کہ غالب نے جو کچھ ایک مصرع میں کہا غنیمت کے دونوں مصرعوں سے زیادہ ہے محض حسنِ ظن ہے۔

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
دلِ ہر ذرہ در جوش انا الشرق

ہم پایہ ہیں جس طرح قطرہ و بحر ایک مگر ظاہر میں مختلف ہیں۔ اسی طرح ذرہ و آفتاب بھی ہیں۔ جو ربط قطرہ و بحر میں ہے وہی ذرہ و آفتاب میں ہے۔ اگر قطرہ ساز انا البحر ہے تو ذرہ آہنگ انا الشرق ہے، کچھ فرق ڈھونڈنا ہے تو غالب کے دوسرے مصرع اور غنیمت کے پہلے مصرع میں ڈھونڈیئے۔ میرا دعویٰ ہے کہ معنوی لطافتوں سے قطع نظر غنیمت کے شعر میں زور اور جوش و خروش کے ساتھ جو ندرت ادا ہے غالب کا شعر اُس سے یک لخت محروم ہے۔ غالب نے دعویٰ کیا کہ "ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا"۔ غنیمت نے اس بحث سے احتراز کیا اور محض کیفیت کی مصوری سے ایک عجیب سماں پیش کر دیا۔ یہ کہنا غلط ہے کہ سر کی قید لگا کر غنیمت نے حقیقت کو محدود کر دیا۔ اسی تخصیص نے مسئلہ وحدت وجود کے اس معمے کو حل کیا کہ ذات باری اور مظاہر کائنات میں کسی قسم کی نسبت ہے۔ غنیمت نے بتا دیا کہ مہر (محبت یا عشق) وجہ ربط ہے۔ مخلوقات عالم امر "اہبطو" کے تابع اپنے مرکز سے جدا ہو گئی ہیں اور دوبارہ ملنے کو بیتاب ہیں۔ یہ نقطۂ اتصال عشق ہے۔ ایک طرف تو خدا ہے جو عشقِ مطلق ہے۔ دوسری طرف انسان امانتِ عشق کا حامل ہے "کل شیٔ یرجع الیٰ اصلہ" جب تک جدائی ہے بیتابی ہے، اضطراب ہے۔ غنیمت کے شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ غالب کے شعر پر اس کی چھاؤں بھی نہیں پڑی

غنیمت کے شعر کی خوبیاں بیان کرنے کی سعی ناکام کرتا ہوں۔

اُس کی محبت نے سینوں کو جولاں گہ برق بنا دیا ہے۔ ایک تو برق میں خود کس قدر تڑپ ہوتی ہے اور سینوں پر بجلی کا گرنا کیا کم ہے یہاں سینے جولاں گہ برق ہیں۔ بجلی کی تگ و دو ہے اور سینوں کا میدان ہے بجلی (اور محبت کی بجلی!) رزم رہی ہے۔ پامال کر رہی ہے اور پوری قدرت و قوت کے ساتھ۔ اس طرح محبت کی محشر زائیاں کس

خوبی سے بیان ہوئیں۔ دل میں خود اضطراب اور کیسا اضطراب موجود ہے مگر جو دل جولاں گہ برق ہے اور اس ناز و ادا سے پامال کیا جائے گا اُس کا کیا عالم ہوگا؟ اس کا جواب دوسرے مصرع میں ہے۔ ہر ذرہ عالم رقص و مستی میں انا الشرق کہہ رہا ہے (میں مطلع انوار ہوں) نہ کہ یوں اترائے گا کہ "ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا"۔ اس کے برخلاف غنیمت کہتا ہے کہ معشوق حقیقی کی محبت کے کرشمے نے دل کو تجلیوں کا خزانہ بنا دیا۔ دل محبت میں خاک ہوا مگر اسی محبت کے فیض سے یہ شرف حاصل ہوا کہ خاکِ دل کا ہر ذرہ طوفانِ انا الشرق برپا کر رہا ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ سوزِ محبت نے تعین کا پردہ جلا دیا اور ذرہ رد کش آفتاب ہوگیا۔ امتیاز جزو کل مٹ گیا۔

حضرت شارح غالب کے اس اترانے پر نازاں ہیں "ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا" حالانکہ یہی تفاخر اتحاد کامل کی تکذیب کرتا ہے۔ ہم وہ نہیں ہیں بلکہ اُس کے ہیں قطرہ و بحر کی تفریق باقی ہے۔

شاعرانہ نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اندازہ ہو کہ غالب نے جس خیال کو پہلے مصرع میں نظم کیا اُس کی تکمیل کے الفاظ نہیں ملے لہذا ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا کہہ کر اپنے زعم میں عہدہ برآ ہو گئے یہ نہ سوچے کہ جو کچھ پہلے مصرع میں کہا اُس پر کچھ اضافہ کیا یا اُس کو بھی پست کر دیا بلکہ نفی کی کیونکہ من و تو کا فرق بحال رہا۔

(۱۶)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا ‏ ‏ ‏ ‏ درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

اس کا موازنہ مولانا روم کی بیت :-

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما ‏ ‏ ‏ ‏ اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اور ظہوری کے مطلع :-

شد طبیبِ ما محبت، منتش برجانِ ما ● محنتِ ما، راحتِ ما، دردِ ما درمانِ ما

6645

سے کیا گیا ہے اور ارشاد ہوا ہے کہ :-

"مولانائے روم نے عشق کا خیر مقدم کیا ہے اور اسے تمام بیماریوں کا معالج قرار دیا ہے۔ لفظ مرحبا (خوش آمدید) سے ایک آنے والے کی چلتی پھرتی تصویر دکھا کر بیان و نفع کو واقعہ کر دکھایا ہے مگر الفاظ نے ہیکل شعر میں محبت کی روح نہیں پھونکی اور شعر حکیمانہ ہو کر رہ گیا اس لئے کہ جملہ علتہا کا مفہوم اوصاف ذمیمہ بشری تک پہنچ کر رہ جاتا ہے یعنی اے عشق تو انسان کو تمام اخلاق ردیہ سے پاک کر دیتا ہے اور بس۔"

عرضِ اثر: پہلی غلطی حضرت شارح کی یہ ہے کہ لفظ مرحبا کا مفہوم عشق کے خیر مقدم تک محدود کر دیا حالانکہ یہ کلمہ اظہار مسرت میں زبان پر جاری ہوتا ہے۔ عام اس سے کہ مہمان کی آمد ہو یا اور کوئی موقع ہو مثنوی کے بعض نسخوں میں مرحبا کی جگہ شاد باش ہے جس کا مفہوم خالی خیر مقدم سے وسیع تر ہے۔ شعر کے مفہوم سے بخوبی واضح ہے کہ قائل عشق کو اس وقت احسنت و آفریں کہہ رہا ہے جب تمام مراحل عشق طے کر چکا ہے اور عشق طبیب جملہ علتہا ثابت ہو چکا ہے۔ اگر شعر کا مطلب وہی ہے جو جناب موصوف سمجھے کہ عشق انسان کو تمام اخلاق ردیہ سے پاک کر دیتا ہے اور بس تو اس سے بدتر شعر ہو ہی نہیں سکتا کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ نعمتِ عشق ایسے شخص کو میسر آ سکتی ہے اور عشق اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے گا جس میں دنیا بھر کی مذموم خصلتیں جمع ہو گئی ہوں اور ان سے نجات کی صورت بجز اس کے نہ ہو کہ عشق کو خوش آمدید کہے اور عشق

اُس کی دعوت قبول بھی کرے۔ بیان کردہ مطلب نہ صرف پست ہے بلکہ بیت کے الفاظ اُس کے منافی ہیں۔ اگر قائلِ شعر عشق کا محض خیر مقدم کر رہا ہے اُس کا پیالہ نہیں پی چکا ہے اور مست و سرشارِ عشق نہیں ہے تو اُس کو عشق کی صفت "خوش سودا" کیوں کر دریافت ہو گئی اور اُس کو یہ اندازہ کیوں کر ہو گیا کہ عشق ہر مرض کی دوا ہے۔ نہیں بشعر اسی منزل کی رہنموئی کرتا ہے جب عشق سے یہ کارنمایاں ظہور میں آ چکا ہو۔ لفظ علت لفظ جملہ کے ہوتے اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے یعنی ہر سبب جو کسی مسبب کا محتاج ہو علت ہے، مرض ہے جسمانی ہو، اخلاقی ہو یا روحانی ہو اس صورت میں ہر خواہش، ہر آرزو ہر تمنا بلا کسی استثنا کے مرض ہے اور طبیب وہ ہے جو تمام اسباب و علل سے آزاد کر دے نہ کہ جیسا حضرت شارح سمجھے ہیں کہ علت سے مراد اوصافِ ذمیمہ بشری ہے اور طبیب وہ ہے جو ان کا معالج ہو۔ جناب موصوف کا ارشاد ہے کہ الفاظ نے مکمل شعر میں محبت کی روح نہیں پھونکی حالانکہ اسی کلمہ شادباش یا مرحبا نے شعر کو سرشاری محبت کا مجسمہ بنا دیا۔ علاوہ برین عشق کی صفت "خوش سودا"، کو نا قابلِ اعتنا یا بھرتی کا سمجھا گیا حالانکہ یہی ٹکڑا نہ معلوم کتنی لطافتیں اپنے دامن میں لئے ہے۔ اسی سے عشق کے اقتدار اور والہانہ شان بے نیازی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اسی سے واضح ہوتا ہے کہ قائل کی نظر میں جو کچھ ہے عشق کے ماسوا کچھ نہیں شعر محض حکیمانہ نہیں ہے بلکہ نشستِ الفاظ نے اس میں وہ شعریت بھر دی ہے کہ معلوم ہوتا ہے ایک سرمست بادۂ عشق انتہائے سرور و بے خودی میں نعمت عشق کا ترانہ سنج ہے عشق نے کونین سے بے نیاز کر دیا۔ صرف عشق خوش سودا ہے اور وہ اور زبان پر یہ نغمہ لاہوتی:

شادباش اے خوش سودائے ما　　　　اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما

وہی شخص "من" کی جگہ "ما" استعمال کر سکتا ہے جو اس مرتبے پر فائز ہو۔
بیت میں عشق سے خطاب نے جو مزا ابھرا اور معنویت میں اضافہ کیا اس کی وضاحت ناممکن ہے، صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ اس تخاطب نے رازدانیٔ عشق کی ایک دنیا پیش نظر کردی معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اور عشق ہم مشرب و یک جان و دو قالب ہیں یہ بلند آہنگی و یک جہتی ظہوری یا غالب کے مطلع میں مفقود ہے۔ ظہوری عشق کے منت گزیں ہیں مساوات اور احسان مندی کا فرق بیّن ہے۔ غالب عشق کے درد بے دوا ہونے کے شکوہ سنج ہیں۔ یہ عشق کے محرم نہیں سُنی سنائی باتیں دہرا رہے ہیں۔
آیئے اب دیکھیں کہ فاضل شارح ظہوری کے مطلع کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔

اُن کی عبارت یہ ہے:۔

"محبت مجھ بیمار کے علاج کی طرف مائل ہوئی ہیں دل و جان سے اس کا منت گزار ہوں محبت میری تکلیف، میری راحت، میرا درد میرا درمان ہے ظہوری نے اس مفہوم کو جسے ملائے رومی نے سیدھے سادے طریقے پر بیان کیا تھا اتنے ٹکڑوں کے اضافے کے بعد بیان کیا: منتش بر جان ما، محنت ما، راحت ما، درد ما، درمان ما کا مفہوم دونوں میں مشترک ہے اظہوری نے محبت کی کرشمہ سازیاں اُن سے اپنے منکشف ہونے کی حالت بیان کردی اور اس طرح کہ مرتبہ کرامت کو پہنچ گئی"۔

عرضِ اثر: میرا گمان ہے کہ جناب موصوف ظہوری کے شعر کا مطلب ہی نہیں سمجھے، وہ یہ نہیں کہتا کہ محبت میری تکلیف، میری راحت، میرا درد، میرا درمان ہے بلکہ کہتا ہے کہ محبت کی بدولت محنت راحت میں مبدل ہوگئی اور درد درمان ہوگیا: "محنتِ ما، راحتِ ما، دردِ ما، درمانِ ما"۔ اب محنت میں بجائے تکلیف کے راحت ملتی ہے اور

خود درد اپنی دوا ہو گیا؛ محنت و راحت، درد و درماں جو متضاد کیفیتیں تھیں، ان کا امتیاز اور اسی کے ساتھ تکلیف کا احساس مٹ گیا۔

پھر حضرت شارح فرماتے ہیں کہ غالبؔ کا شعر ظہوری کے شعر سے کہیں بالا تر ہے۔ مرزا نے زندگی کو ایک درد قرار دیا اور یہ بتایا کہ جب تک عشق نہ ہو زندگی بے کیف ہے دوسرے مصرع میں اور ترقی کی یعنی ابھی تک زندگی کو صرف بے مزہ کہا تھا اب کہتا ہے کہ زندگی بے کیف ہی نہ تھی بلکہ درد تھی، مرض تھی اور مرض بھی کیسا جس کی دوا عشق کے سوا کچھ اور تھی ہی نہیں۔ مگر یہ دوا ہے کیسی؛ خود ایک درد لا دوا۔ ظاہر ہے کہ عشق مجازی ہو یا حقیقی بہر حال لذتِ زندگانی کا کفیل ہے اور اہلِ تحقیق جانتے ہیں کہ محبت کا جذبہ فنا ہو جائے تو انسان کہنے کو زندہ حقیقت میں مردہ ہے۔

عرض اثرؔ: مولانائے روم کی بیت کا تو ذکر کیا غالبؔ کا مطلع ظہوری کے مطلع کے بھی پاسنگ نہیں۔ ظہوریؔ نے "شد طبیبِ ما محبت" میں وہ کچھ کہہ دیا ہے جو غالبؔ نے پورے پہلے مصرع اور دوسرے مصرع کے جزو اول میں کہا یعنی عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا   درد کی دوا پائی۔

لفظ طبیب سے معلوم ہوا کہ ہماری زیست ایک مرض تھی۔ جان مبتلائے آزار تھی عشق چارہ ساز ہوا، درد کی دوا مل گئی "منقش بر جانِ ما" میں لفظ جان خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عشق طبیب روحانی ہے۔ دوسرے مصرع میں بتایا کہ زندگی درد کیوں تھی اور عشق نے اس کو لذت میں کیوں کر بدل دیا۔ زندگی مجموعہ ہے تغیرات اور متضاد کیفیات کا جو ہمیشہ رونما ہوتے رہتے ہیں ان کا تجزیہ کیا جائے تو سب سے اہم اور مہتم بالشان محنت و راحت اور احساس درد و فکر و درماں ہیں۔ ان کا

تمنا تقش مٹا نہیں کہ زندگی نغمۂ شیریں بنی۔ یہ معجزہ صرف عشق دکھا سکتا ہے جو محنت کو راحت میں بدل دیتا ہے اور درد میں بجائے ایذا کے لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔

مولانائے روم، ظہوری اور غالب تینوں نے عشق کی مدح کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس نے عشق کے بہترین اور امتیازی خصوصیات ایسے پیرایے میں بیان کئے ہیں کہ عشق سے عشق ہو جائے (بزبان میرؔ آپ ہی اپنا مبتلا ہے") اس لحاظ سے فارسی کے دونوں شعر غالب کے شعر سے کہیں بہتر ہیں۔ ان سے عشق کی روح پرور اور کیف زا حالت کا نقشہ کھنچ جاتا ہے مگر غالب کا شعر جذبۂ عشق کی ایک ناقص اور نامکمل تصویر ہے۔ یہ منظور کہ عشق درد ہے اور ایسا درد جو لذت زندگی کا کفیل ہے اور اس درد کا کوئی خارجی مداوا نہیں لیکن اسی کے ساتھ عشق وہ جذبۂ کامل بھی ہے جس سے اضداد کی تفریق مٹ جاتی ہے، عشق درد بھی ہے اور درمانِ درد بھی ہے (پھر بزبان میرؔ عشق کے درد کی دوا ہے عشق) عشق کی یہی خصوصیت (درد بھی اور درمانِ درد بھی) ہے جو غالب کے یہاں مفقود اور مولانائے روم اور ظہوری کے اشعار میں موجود ہے۔ غالب کے مطلع کا آخری ٹکڑا (درد بے دوا پایا) اپنی خامی کی غمازی کر رہا ہے۔ ان کی نظریں اُس کیف آفرینی سے محروم ہیں جو عشق میں مضمر ہے جو درد کا احساس مٹا ہی نہیں دیتی بلکہ عشق کے سوا تمام جذبات سے بے نیاز کر دیتی ہے علاوہ بریں غالب کے مطلع میں وہ سرشاری اور خوشی کی ترنگ نہیں جو ان باکمالوں کے یہاں (بالخصوص مولانا روم کی بیت میں) ہے۔ اس اضمحلال کا باعث بھی درد بے دوا کا ٹکڑا ہے جس نے بجائے عشق کا دم بھرنے کے اُس کے گلے پر آمادہ کر دیا اور جذبۂ احسان مندی و تشکر کو جس کی جھلک پہلے مصرع میں تھی فنا کر کے بوالہوسی کا شائبہ پیدا کر دیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ غالب کا مفقود

عشق بالذات نہ تھا بلکہ حصولِ مطلب کا وسیلہ بنانا چاہتے تھے، گر درد بلے دوا یا کر محرومیٔ قسمت کا رونا شروع کر دیا۔ کہاں وہ قدرت و سرمستیٔ عشق جو مولانائے روم کے شعر میں بدرجۂ اتم اور اس سے کم ظہوری کے شعر میں پائی جاتی ہے کہاں یہ ناچاری اور نامرادی و تنگ نظری کہ عشق کا چارہ ساز ڈھونڈا جا رہا ہے۔ وہی مثل ہوئی کہ

آب در کوزہ و من گردِ جہاں می گردم

گویا جسے دردِ عشق مل جائے وہ اور کسی نعمت کا بھی متمنی ہو سکتا ہے۔

(۱۷)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ۔۔۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اقوالِ شارحین: خود غالبؔ نے یہ مطلب بیان کیا ہے۔

"ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ (فریادی) کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا، خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کر لیجانا پس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے جو صورتِ تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبارِ محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہے۔"

دیگر شارحین: (۲) انسان کی بے بودہستی اور کشاکشِ حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچ گیا ہے۔ حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ کسی چیز کی بھی ہو باعثِ تکلیف و رنج ہے حتیٰ کہ تصویر تک بھی جو کہ صرف ایک ہستیٔ محض ہے بزبانِ حال فریاد کر رہی ہے کہ مجھ کو ہست کر کے کیوں رنجِ ہستی میں مبتلا کیا جیسا کہ کاغذ پیرہنی سے ظاہر ہے۔

(۳) مولانا روم نے اس مفہوم کو ان اشعار میں ادا کیا ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　　وز جدائیہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند　　　　از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مطلب یہ ہے کہ اصل سے جدا ہونے کے بعد اضطراری کیفیت پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ نَے جب نیستان سے جدا ہوتی ہے تو اس میں فریاد کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخیٔ تخلیق کی زبان حال سے فریاد کرنے لگتی ہے۔

(۳) ہر پیکر تصویر سے مراد جملہ حیوانات جمادات اور نباتات سے ہے اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں جب موجودات عالم کا یہ حال ہے تو نقش ہستی کا اپنی بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیل بلند اور غیر معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے۔

(۴) جب تک اس شعر میں کوئی ایسا لفظ نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو اس وقت تک اُسے بامعنی نہیں کہہ سکتے۔ مصنف کی غرض تھی کہ نقش تصویر فریادی ہے ہستی بے اعتبار و بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیرہن ہونے کا۔ شعر میں ہستی بے اعتبار کی گنجائش نہ ہو سکی اس سبب سے کہ قافیہ مزاحم تھا اور مقصود تھا مطلع کہنا۔ اس لئے ہستی کے بدلے شوخی تحریر کہدیا۔ شعر بے معنی ہے۔

عرض اثر:- یہ مطلع سر دیوان ہے جو اکثر و بیشتر حمد باری عزاسمہ میں ہوتا ہے

نقش = صورت۔ ہر شے جو خلق ہوئی ہے ایک نقش ہے۔

فریادی = فریاد کرنے والا

کس کی = تجاہل عارف۔ مراد خدا سے ہے۔

شوخیٔ تحریر = خوبی تحریر، نقش و نگار (خطوط و دوائر کی رعنائی و دلکشی نہ کہ بیداد

تحریر جیسا کہ دیگر شارحین کا خیال ہے۔ شوخیٔ رفتار و شوخیٔ گفتار عام طور پر زبان زد ہیں۔ ان سے رفتار و گفتار کی لطافت و ندرت کا اظہار ہوتا ہے نہ کہ بیداد کا۔ غالباً مومن کا شعر ہے:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

لہذا شوخیٔ تحریر سے نقاشِ ازل کی بے مثل صنعت گری یعنی خوبیٔ تخلیق کی طرف اشارہ ہوتا ہے

کاغذی پیرہن = ایسا لباس جو کمزور اور بے ثبات ہے۔ کاغذ کا بودا ہونا بدیہی ہے۔ اور بطور مثال استعمال ہوتا ہے۔ کپڑا کمزور ہو تو کہتے ہیں کہ کاغذ کی طرح پھٹتا ہے۔ کاغذ ایک بوند پانی پڑنے سے گوندا ہو جاتا ہے۔ فریادیوں کے کاغذی لباس کی تلمیح ایک ضمنی خوبی ہے۔ نفسِ مضمون کا سمجھنا اس رسم کے علم کا محتاج نہیں۔

پیکرِ تصویر = تصویر کا رنگ، روغن، نقش و نگار

شعر کا مطلب: ہر شے زبانِ حال سے فریاد کر رہی ہے کہ اے ہمارے پیدا کرنے والے مصورِ بے بدل تو نے ہماری تخلیق و تشکیل میں کیا کیا صنعتیں اور حکمتیں صرف کیں (کسی درخت کی پتیوں کو لے لیجیے، بظاہر مشابہ مگر کوئی دو پتیاں ہو بہو یکساں نہ ہوں گی ایک قطرۂ آب میں کل جہان سمایا ہوا ہے۔ ذرے کے جوہر عیاں ہوتے جاتے ہیں) (ہر جا جہانِ دیگر، ہر طرف محفل نو بنو آراستہ!) لیکن کیا قیامت ہے کہ: "ہر شے مسافر، ہر چیز راہی" (اقبال) جو ہے دست بردِ فنا میں ہے، نہ قرار ہے نہ ثبات ہے اگر مٹانا تھا تو بنانے میں اتنا اہتمام اتنا تکلف کیوں کیا؟

شعر ہی میں اس معمے کا حل بھی موجود ہے۔ تصویر کا پیرہن کاغذی ہے جسم فانی ہے، وہ روح جو ہر شے میں دوڑی ہوئی ہے جوہر تو ہے "روحِ اعظم" کا وہ لافانی ہے۔

گیتا کی زبان میں ؎

بدلتے ہیں جس طرح رختِ کہن
یہی روح کا جسم سے ہے چلن

(۱۸)

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

خود غالب کا بیان کردہ مطلب یہ ہے :

"آئینہ فولاد کے آہینہ سے ہے ورنہ حلبی آئینوں میں جوہر کہاں اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کروگے بے شبہ ایک لکیر پڑے گی۔ اس کو الف صیقل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اب اس کے مفہوم کو سمجھئے ع

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سن تمیز سے مشق جنون ہے۔ اب تک کمال فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہوگیا ہے بس وہی ایک لکیر صیقل کی موجود ہے۔ چاک کی صورت الف کی سی ہوتی ہے اور چاکِ جیب آثارِ جنوں میں سے ہے"

عرضِ اثر : غالب کے بیان کردہ مطلب سے خالی الذہن ہو کر صرف الفاظِ شعر کی بنا پر جو کچھ سمجھا ہوں بیان کرتا ہوں۔

یک الف صیقل گروں کی اصطلاح ہے۔ الف معیار صیقل ہے۔ ایک الف صیقل ہوئی دو الف ہوئی وغیرہ۔ غالباً اصطلاح یوں وضع ہوئی کہ آلہ صیقل کا سرا عربی کے الف سے مشابہ ہوتا ہے۔

آئینہ : جیسا غالب نے کہا اصل میں آہینہ تھا منسوب بہ آہن۔ فولاد کو صیقل کرتے تھے اور اس میں صورت دکھائی دینے لگتی تھی۔ شعر میں آئینہ دل سے کنایہ ہے۔

گریبان چاک کرنا = علامتِ جنون۔ شاعری میں جنون خلل دماغ کا مرادف نہیں بلکہ عشق کی وہ منزل ہے جب انسان تصورِ محبوب میں دنیا دما فیہا سے بے خبر و بے نیاز ہوجاتا ہے۔ گریبان کا چاک یا تعویذ بھی الف سے مشابہ ہوتا ہے۔ گویا چاک گریبان ہونا (بیخودیٔ عشق) وہ آلہ ہے جس سے آئینہ دل کی جلا ہوتی ہے۔

شعر میں تعقید لفظی ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے لکھا ہے کہ فارسی میں تعقید لفظی حسن ہے، اردو فارسی کی تبع ہے لہذا شعر میں تعقید لفظی معیوب نہیں بلکہ مستحسن ہے۔ اس امر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شعر کی نثر یوں ہوگی جب کہ میں گریباں چاک کرنا ہوں سمجھا (کیا سمجھا؟) ایک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز" ابتدائے سن تمیز سے یعنی ہوش آتے ہی گریباں چاک کرنا مشق جنوں کرنا خلاف قیاس ہے کیونکہ گریباں چاک کرنا ہوش وخودی سے بیگانہ ہوجانا عشق کی بلند ترین منزل ہے جہاں تک بیک برخاستن رسائی نہیں ہوتی کتنے ہی مرحلے طے کرنا ہوتے ہیں۔

شعر کا مطلب میں نے عقل نہیں بلکہ عشق و وجدان کے ذریعے سے آئینہ دل کو صاف مجلّی کرنا شروع کیا تاکہ انوار سرمدی اس میں منعکس ہوں، اسرار کا گنجینہ کھلے۔ یہ محویت اور مشقِ تصور ایک مدت سے جاری ہے لیکن افسوس کہ اب تک محروم ہوں صیقل آئینہ ناتمام ہے، ایک الف سے زیادہ نہیں۔ تصفیۂ قلب کا تکملہ نہیں ہوا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ معرفتِ ذات دشوار نہیں بلکہ محال ہے۔ شعر میں یہ بلیغ نکتہ مضمر ہے کہ اپنے جہل کا علم ہونا اور جہد کے بعد اعتراف ناکامی بجائے خود ایک بلند منزل ہے اور کیا عجب کہ یہی شرم نارسائی حجابات دوری اٹھادے۔

خود غالب کی شرح کے ہوتے عجب نہیں کہ میری خامہ فرسائی مدّعی سست

گواہ چست کی مصداق ٹھہرے لیکن دھیان رہے کہ یہ امر مسلمہ ہے کہ بسا اوقات شاعر خود اپنے کلام کی تشفی بخش شرح میں عاجز رہتا ہے۔ اس امر کا متعدد شاعروں نے اعتراف کیا ہے۔ شیکسپیئر پر اتنا لٹریچر جمع نہیں ہو سکتا تھا اگر اس کی شاعری کے اتنے متنوع پہلو نہ ہوتے اور یہ بعید از قیاس ہے کہ وہ سب پہلو اس کے ذہن میں تھے۔

(۱۹)

دل حسرت زدہ ہے مائدۂ لذت درد　　کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

اقوال شارحین: (۱) میرے حسرت زدہ دل کے دسترخوان پر لذتِ درد کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ میرے دوستوں نے اپنے اپنے لب و دنداں کی قوت کے مطابق میرے دسترخوانِ درد سے درد کا ذائقہ چکھ لیا، گویا ہر شخص بقدر استعداد متاثر ہوا (۲) میرے دسترخوان پر لذتِ درد کی کمی نہ تھی لیکن یاروں کو ان کی قابلیت کے موافق حصہ ملا۔ (۳) بقدر لب و دندان کے معنی کم کے ہیں یعنی دوست میرے مائدہ درد پر ہونٹ ہی کاٹتے رہے، بہت کم غم کھایا

عرض اثر: ان شرحوں میں "دل حسرت زدہ" کے قبل لفظ "میرا" مقدر فرض کیا گیا ہے اسی طرح یاروں سے مراد میرے دوستوں" لی ہے۔ اس تخصیص نے شعر کے مفہوم کو محدود ہی نہیں بلکہ پست کر دیا۔ شاعر کا دل حسرت زدہ لذتِ درد کا مائدہ (دسترخوان) ہے۔ بایں ہمہ وہ نہیں بلکہ اس کے دوست بقدر حوصلہ درد کا ذائقہ چکھ رہے ہیں! یہ کیا بوالعجبی ہے؟ لفظ میرے کے اضافے سے لفظ یاروں کے مفرد صرف میں جو لطف محاورہ و زبان تھا وہ بھی رخصت ہو گیا۔ اس لفظ یاروں کے مفرد استعمال میں ایک قسم کا طنز ہوتا ہے تعمیم ہوتی ہے ـــ حریفوں کا مفہوم نکلتا ہے جس کا اطلاق موافقین

دمخالفین پر یکساں ہوتا ہے بشرطیکہ ہم پیشہ وہم مشرب یا ہم صحبت ہوں۔ ذوقؔ
کہتا ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

محتسب گرچہ دل آزار ہے مے خوارں کا (ایضاً) دیجیے اک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا

اب غالبؔ کا شعر لیجیے۔ وہ ایک کلیہ قائم کرتا ہے کہ جو دل بھی حسرت زدہ ہے
(ناکام ونامراد ہے) وہ ایسا دسترخوان ہے جس پر درد کی انواع واقسام کی لذیذ
نعمتیں چنی ہوئی ہیں۔ نہ عاشق کی حسرتوں کی حد ہے نہ ان حسرتوں کی مہیا کی ہوئی
نعمتوں کی انتہا ہے حسرتوں کے خون کے ساتھ ساتھ مائدہ لذت درد وسیع
ہوتا جاتا ہے اور جس میں جس قدر درد وغم سے لذت اندوز ہونے کی صلاحیت
ہے اسی نسبت سے فیضیاب ہوتا ہے۔

شعر کا ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ عشق کی عظمت کا راز خواہشات کے پورے
ہونے میں نہیں بلکہ ترکِ تمنا یا ناکامیٔ تمنا اور اس کے بعد درد محرومی سے کیف لینے میں ہے۔

والٹر سیوج لینڈور (WALTER SAVAGE LANDOUR) کہتا ہے۔

"شاعر اور فلسفی محبت کے متعلق استدلال کرتے ہیں اور محبت کے خواب دیکھتے ہیں
مگر شاذ ہی اس شے پر دسترس ہوتا ہے جس سے محبت ہے اور جب دسترس ہوتا
ہے تو وہی شے نادیدہ دیوی بن جاتی ہے اور یہ اس کے خاموش پجاری۔"

کیا یہی اردو کی غزلیہ شاعری کا اعلیٰ معیار نہیں ہے؟

(۴۰)

رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

پہلے مولانا نظم طبا طبائی کی شرح اور اس پر پروفیسر حامد حسن قادری کی تنقید کی طرف توجہ دلا دوں۔

نظم طبا طبائی :-

"اس شعر میں معلوم ہوتا ہے کہ (کا) کی جگہ (کی) کاتب کا سہو ہے اور اس صورت میں معنی صاف ہیں لیکن عجب نہیں کہ (کو) ہی کہا ہو تو معنی ذرا تکلف سے پیدا ہوں گے یعنی واماندگی کو میرے قدم سے عشق ہو گیا ہے اور وہ نہیں چھوڑتی کہ میں منزل مقصود کی طرف جاؤں، شعر میں مصنف نے منزل سے راہِ منزل مراد لی ہے چنانچہ (میں) کا لفظ اس پر دلالت کرتا ہے یعنی محاورہ میں جب (میں) کے ساتھ بولیں گے تو راہِ منزل اس سے مراد ہوتی ہے اور جب (پر) کے ساتھ کہیں تو خود منزلِ مقصود مراد ہوتی ہے اور فارسی والوں کے محاورہ میں عشق بمعنی سلام و نیاز بھی ہے اور اس صورت میں (کو) صحیح ہے یعنی ہم واماندگی کے نیاز مند ہیں کہ اس کی بدولت :

"اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے"۔

پروفیسر حامد حسن قادری :

"یہ شعر غالب کے ضعفِ نظم اور ناتمامی بندش کی متعدد مثالوں میں سے ایک مثال ہے لیکن غور کیجیے تو (کی) کاتب کا سہو نہیں معلوم ہوتا اگر غالب (کا) لکھتے تو اس سے بہتر (سے) کا لفظ تھا نظم صاحب نے (کو) سے جو مطلب بتایا ہے وہی غالب کا مقصود ہے۔ اگرچہ (واماندگی کو عشق ہے) اپنے مفہوم کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ کہنا چاہئے تھا کہ "واماندگی کو ہم سے عشق ہے" لیکن نظم صاحب نے جو "عشق" کے دوسرے

معنی "سلام و نیاز" کے تے ہیں۔ یہ اُن کی بدمذاقی پر دلالت کرتے ہیں جس کی ان سے امید نہ تھی۔ اس صورت میں گویا غالب۔ یہ کہتے ہیں کہ "ہم زحمت سفر کیوں اٹھائیں ہمارا تو واماندگی کو آداب وتسلیم ہے"۔ عشق کو نیاز و بندگی کے معنوں میں لینا اُردو کیا فارسی کا بھی عام محاورہ نہیں ہے آزادوں اور قلندروں کی اصطلاح ہے کہ سلام کے موقع پر عشق اللہ کہہ دیتے تھے۔ اس کو یہاں چسپاں کرنے کا کیا محل تھا"

طباطبائی مرحوم کے الفاظ جن پر قادری صاحب نے بدمذاقی کا فتویٰ جاری کیا ہے یہ ہیں "فارسی والوں کے محاورہ میں عشق بمعنی سلام و نیاز بھی ہے"۔ اور اس میں کوئی جائے تامل نہیں۔ بہار عجم کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"عشق ..... بالفظ زدن و گفتن بیک معنی آید و این با صطلاح رند بمنزلہ سلام گفتن بود کہ گاہ بمعنی مشہور می آید کہ نعل شریعت و گاہ بجائے الوداع استعمال کنند"

ملا وحشی ؎

زمن عشقے بگو دیوانگان عشق را وحشی
کہ من زنجیر کردم پارہ از دار الشفا رفتم

میرزا عبدالقادر بیدل ؎

عشق زد شمع کہ اے سوختگاں خوش باشید
شعلہ ہم آب بقائیست کہ من می دانم

میرزا صائب ؎

بہ بوستان تو عشقے بلند می گویم
چو شبنم از گل رویت نبود می شنویم

کاش پروفیسر صاحب طباطبائی مرحوم کو بدمذاقی سے متہم نہ کرتے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ "عشق ہے" کا صحیح مطلب نہ طباطبائی صاحب سمجھے نہ پروفیسر حامد حسن قادری۔ یہ اُردو کا ایک متروک محاورہ ہے جس کے معنی ہیں "آفریں"، "مرحبا!"۔ استاد

ملاحظہ ہوں:۔

"ISHQ HAI" (SLANG) INTJ: EXCELLENT. WELL-DONE! (FALLON,S DICTINARY)

("عشق ہے" (عامیانہ) کلمۂ استعجاب۔ بہت خوب! شاباش) (فیلن کی ڈکشنری)

"ISHQ HAI" AN EXCLAMATION OF PRAISE EXCELL-ENT WELL-DONE! BRAVO! (PLATT,S DICTIONARY)

(کلمۂ تحسین بہت خوب! شاباش!) (پلیٹ کی ڈکشنری)

نوراللغات: "عشق ہے" آفریں ہے، شاباش ہے۔ یہ کلمہ فقرا آپس میں بولتے ہیں۔
اشعار میر جن میں "عشق ہے" بمعنی مرحبا یا آفریں نظم ہوا ہے:

شب شمع پر پتنگ کے آنے کو عشق ہے (۱) اس دل جلے کے تاب کے لانے کو عشق ہے
اک دم میں تو نے پھونک دیا دو جہاں کے تئیں (۲) اے عشق تیرے آگ لگانے کو عشق ہے
عشق اُن کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن (۳) کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

ان اشعار میں "عشق ہے" کلمۂ تحسین بمعنی آفرین یا مرحبا ہے اور یہی مفہوم غالب کے شعر میں بھی ہے، کہتا ہے کہ واماندگی کو آفریں ہے کہ اس نے زحمتِ رہ نوردی سے بچالیا اس طرح شل اور مجبور و ناچار ہو کر جب منزل سے دور بیٹھ گئے تو ہمارا جو قدم اُٹھ نہیں سکتا وہ (درحقیقت) منزل میں ہے کیونکہ منزل کی طرف گامزن ہونے کی وجہ پست ہمتی نہیں بلکہ واماندگی ہے بشوق منزل بدستور ہے۔ پاؤں جواب دے گئے اور منزل تک رسائی کی طاقت نہ رہی۔ اس مطلب کو غالب ہی کے دوسرے شعر سے تقویت پہنچتی ہے۔

نہ ہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

یعنی ذوقِ منزل تصور میں قطعِ مسافت کرتا رہے گا۔

(۲۱)

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

اقوالِ شارحین: (۱) عربدہ میداں = میدانِ جنگ
میدان مانگنا = جنگ کرنا
عجزِ ہمت = پست ہمتی

دلِ سائل کو ایک طلسم اور میدانِ عربدہ کو یاس و امید قرار دیا ہے اور اس طلسم کو پست ہمتی کا بانی۔ میری پست ہمتی نے میرے دل کو ایک میدانِ طلسم بنا رکھا ہے جس میں یاس و امید میں جنگ ہو رہی ہے اور دونوں ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پست ہمتی امید و بیم کی جنگ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ (۲) سوال کرنا بہت برا ہے اور یہ پست ہمتوں کا کام ہے جس سے دل طلسمِ امید و بیم بن جاتا ہے۔
عرضِ اثرؔ: عربدہ = جنگ۔ میدان = وسیع اور کشادہ جگہ۔ یک عربدہ میداں (بلا اضافت) میدانِ جنگ کی سی وسعت۔ چونکہ کشاکشِ امید و یاس دکھانا ہے لہٰذا عربدہ کے ساتھ میدان لائے تاکہ امید و یاس کی فراوانی کا اظہار ہو جس طرح افراطِ ماندگی دکھانے کو بیاباں کثرتِ آرزو کے لئے شہر اور رسوائی کے لئے کوچے کا پیمانہ وضع کرتے ہیں۔ عربدہ اور میدان کے درمیان جب اضافت نہیں ہے تو ہمیں اضافت فرض کرنے کا کوئی حق نہیں۔ طلسم = فریب نظر بندی۔ دلِ سائل = ایسا دل جو حاجتمند ہو نہ کہ گدا کا دل۔ شعر کا مطلب یہ ہوا کہ بیکار امید و یاس کے امکانات آزمانے کو میں اپنے حوصلوں اور ارادوں کا میدان وسیع کرنا چاہتا تھا تاکہ مختلف و متنوع واقعاتِ حیات کے سلسلے میں ان کی جنگ کا تماشا

دیکھوں مگر سہل انکاری اور پست ہمتی نے فریب دیا کہ اس جھگڑے میں کہاں پڑو گے صرف
انھیں امور میں قسمت آزمائی کرو اور امید و یاس کے کرشمے دیکھو جن کی طرف دل اُٹھے
جن میں تمہاری ذاتی غرض شامل ہے۔ اس طرح آزمائش کا دائرہ تنگ ہوکر چند مفروضات
میں گھر گیا اور یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ انسان کے حوصلے میں کتنی گنجائش ہے اور عزائم کی تگ و دو
کے لئے کیسے کیسے میدان پڑے ہوئے ہیں۔ آزمائش جاری رہتی اور وسیع پیمانے پر ہوتی تو ممکن
تھا کہ وہ منزل آجاتی جہاں امید و یاس کی کش مکش ختم ہو کر طبیعت کو یکسوئی حاصل ہو جاتی ہے

(۲۲)

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مولانا حالی نے اس شعر کے دو مطالب بیان کئے ہیں

(۱) جس دشت میں ہم ہیں اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا
ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی مگر دشت بھی
اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

مجھے ان دونوں مطالب سے اختلاف ہے کیونکہ ان میں گھر کو چھوڑ کر دشت
گردی اختیار کرنے کی وجہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں میرے نزدیک شعر کا یہ مطلب ہے کہ
مجھے دشت میں ایسے مقام کی تلاش ہوئی جو گھر سے زیادہ ویران ہو لہذا دشت کا رخ کیا
وہاں پہنچ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں ناحق سے زیادہ تو میرا گھر ہی ویران تھا۔
اگر شعر میں ویرانی سی ویرانی ہے کے بیشتر لفظ کوئی نہ ہوتا تو بیشک شدت کی
ویرانی کا مفہوم نکلتا مگر لفظ کوئی نے شدت ویرانی دشت کی تنکیر و تنقیص کر دی اور

وہی قرینہ پیدا ہوا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا۔

اب نسخۂ حمیدیہ کے چند اشعار پر طبع آزمائی کی جرأت کرتا ہوں۔ یہ ان میں سے ہیں۔ جو مروجہ دیوان کی ترتیب کے وقت خارج کر دیئے گئے تھے۔

(۲۳)

شب کہ تھی کیفیتِ محفل بیادِ روئے یار ہر نظر داغِ مے خالِ لبِ پیمانہ تھا

شعر درج یوں ہی ہے مگر موجودہ صورت میں اس کی صحت مشتبہ ہے کیونکہ فعل "تھا" کا فاعل "نظر" مونث ہے لہذا ردیف غلط ہوئی جاتی ہے عجب نہیں کہ "نظر" کے بعد لفظ "میں" سہوِ کاتب سے چھوٹ گیا ہو اور مصرع یوں ہو: ہر نظر میں داغِ مے خالِ لبِ پیمانہ تھا شعر کا مطلب یہ ہوا کہ شب کو یادِ روئے دوست میں مے کشی ہو رہی تھی (وہ خود موجود نہ تھا) تاہم محفل کیفیت سے خالی نہ تھی کیونکہ لبِ جام لبِ معشوق کی یاد تازہ کرتا تھا اور لبِ جام پر جو قطرۂ مے جم گیا تھا وہ تبخالۂ لبِ معشوق سے مشابہ تھا لہذا دوریِ دوست میں بادہ پیمائی لائقِ سرزنش نہیں۔ اس کی یاد سرمایہ سرور و انبساط تھی اور دعوت پیمانہ آرائی دے رہی تھی۔

(۲۴)

داغِ مہرِ ضبطِ بے جا ستی سعی پسند دود مجمر لالہ ساں دُردِ تہ پیمانہ تھا

دوسرے مصرع میں ایسی چیزیں انتخاب کی گئی ہیں جن میں ایک ہوتے بھی دو کیفیتیں پائی جاتی ہیں: مجمر اور دودِ مجمر (آگ اور دھواں)، لالہ اور داغِ لالہ، شراب اور دُردِ تہ پیمانہ۔

اب پہلا مصرع لیجئے۔ داغ (دل کا داغ مراد ہے) کیا ہے؟ سعی پسند کی بے جاستی ہستیِ بے جا کی مہرِ ضبط ہے (خاموش اور باز رہنے کا حکم ہے) داغ کو مہر سے استعارہ

کیا ہے۔ مماثلت ظاہر ہے مطلب یہ ہوا کہ میں نے نشے کی ترنگ میں حقائق اشیاء پر فیصلہ کرنے کو غور کیا کہ کون شے کس سے بہتر ہے کس کو کس پر ترجیح ہے تاکہ اُسی کو پسند اور اختیار کروں۔ دماغ سوزی کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ

"لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی"

موجودات عالم مثل اُس دھوئیں کے ہیں جو مجمر (انگیٹھی) سے بلند ہو رہا ہو۔ ان کی حالت بعینہٖ وہی ہے جو لالہ و داغ لالہ کی ہے کہ جزو لالہ ہے مگر بظاہر مختلف۔ یا جو کیفیت شراب اور دُردِ شراب کی ہے کہ جزو شراب ہے مگر دیکھنے میں متبائن۔ یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جو چیزیں انتخاب کی گئی ہیں ان کا ایک جزو لطیف اور ایک جزو کثیف ہے نیز جزو کثیف اپنے وجود اور ماہیت کے لئے جزو لطیف کا محتاج ہے۔ آگ نہ ہو تو دھواں محال ہے۔ لالہ نہ ہو تو داغ لالہ کہاں سے آئے۔ شراب نہ ہو تو دُرد یا "تلچھٹ" کا وجود نہ ہو۔ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ مثال میں جو چیزیں منتخب کی گئی ہیں دل سے مشابہ ہیں مجمر و دود مجمر = دل اور داغ دل۔ لالہ و داغِ لالہ = دل اور داغِ دل پیمانہ و دُردِ پیمانہ = دل اور داغ دل۔ ان اشیاء کے مشاہدہ سے انکشاف ہوا کہ ہر شے جو مادی ہے بلا کسی استثنا کے اپنی ہستی اور بقائے ہستی کے لئے ایک جوہر لطیف کی محتاج ہے۔ اشیاء کا ظاہری فرق اعتباری ہے۔ ان کے پردے میں حقیقت اپنے کرشمے دکھا رہی ہے۔ اس کلیہ کا اطلاق تمام مخلوقات عالم پر ہوتا ہے کوئی اس سے بری نہیں اس احساس نے انھیں چیزوں کی طرح جو اس معرفت کی محرک ہوئی تھیں یعنی مجمر و لالہ و مُل میرے دل پر بھی مہر داغ ثبت کی۔ ہونٹ سی دئے، چپ لگ گئی اور اپنی جرأت رندانہ (بے جا سعی پسندی) پر ندامت ہوئی۔

(۲۵)

وصل میں بختِ رسا نے سنبلستاں گل کیا　　　　رنگِ شب تہ بندیِ دودِ چراغ خانہ تھا

سنبلستاں ۔ زلف کی تشبیہ سنبل سے عام ہے ۔

گل کیا ۔ گل کرد کا ترجمہ ہے شگفتہ کیا ۔

تہ بندی ۔ اس کے معنی "بہار عجم" سے نقل کئے جاتے ہیں ۔

" چیزے کہ پیش از خوردن شراب وغیرہ خورند مرادف تہ پا و باصطلاح رنگریزاں رنگے باشد کہ لجامہ را پیش از رنگ کردن دہند تا آں رنگ کہ مطلوب است قوی و دلخواہ شود "

محسن تاثیر ؎

خون دل من می کند تہ بندی صہبائے تو　　　　گلشن بغارت می دہد رنگِ حنائے پائے تو

باقر کاشی ع　　　　لالہ تہ بندیِ داغِ شبِ ہجرانم کرد

جز و بندی کتاب

سعید اشرف ؎ تہ بندی ہوش برقرار است　　　　شیرازہ طبع پا بدار است

غالب کے شعر میں "تہ بندی" رنگریزوں کی اصطلاح میں استعمال ہوا ہے کہ پہلے کپڑے کو ہلکا ڈوب دیا پھر گہرا شوخ رنگ چڑھایا ۔

شعر کا مطلب یہ ہوا کہ شب وصال معشوق کی زلفیں اس حسن سے بکھریں کہ ہر طرف سنبلستان نظر آنے لگا اور زلفوں کی سیاہی کے مقابلہ میں رات کی سیاہی اس ہلکے رنگ کی ایسی ہوگئی جو محض تہ بندی کا کام دیتا ہے ۔ زلفوں کی سیاہی شب کی تاریکی پر غالب آگئی ۔ شب گھونگھٹ کھا کر وہ دھندلا حلقہ بن گئی جو چراغ کی لو کے

نیچے ہوتا ہے۔ اُدھر زلف کی ظلمت میں محبوب کا چہرۂ پر نور چمک رہا تھا اور وہ نظارۂ نور و ظلمت صورت پذیر ہوا جس کی مثال اگر ملتی ہو تو چراغ کی لو میں جہاں روشنی اور تاریکی جمع ہوتی ہیں تاہم جدا جدا رہتی ہیں۔

(۲۶)

دود کو آج اُس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی   وہ دل سوزاں کہ کل تک شمع ماتم خانہ تھا

وہ دلِ سوزاں (دردمند و گداختہ، آتش عشق کا تپایا ہوا) جس سے ماتم خانہ (ہستی) کی زینت تھی جو سب کا شریک غم تھا۔ آج وہ جل کر خاک ہو گیا یا بجھ گیا تو اُس پر خود اُس کے دھوئیں کے سوا کوئی سوگوار نہ تھا۔ شعر نہیں عبرت کی زندہ تصویر ہے۔ مصرع اول میں ایک ایسا واقعہ دکھایا ہے جس سے غالب کی دقتِ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ شمع کے گل ہونے پر جو دھواں نکلتا ہے وہ اُس دھوئیں سے کثیف تر ہوتا ہے جو شمع کے روشن ہونے کی حالت میں برآمد ہوتا ہے۔ اسی کو دود کی سیہ پوشی سے تعبیر کیا ہے۔

(۲۷)

حیرت اپنی نالۂ بے درد سے غفلت بنی   راہ خوابیدہ کو غوغائے جرس افسانہ تھا

نالۂ بے درد = ایسا نالہ جو درد سے خالی ہے

چونکہ نالہ درد اور تاثیر سے خالی تھا اُس نے میری حیرت کو غفلت میں بدل دیا حالانکہ نالہ کا مطلب یہ تھا کہ کوچ کے لئے تیار ہو جاؤ یعنی نالہ صدائے جرس تھا مگر میں ایسا راہ خوابیدہ تھا (غافل تھا۔ رستے میں سونے والا تھا) کہ میرے حق میں شورِ جرس نے بجائے ہشیار کرنے کے افسانے کا کام کیا (اور بھی غافل کر دیا) حیرت کا غفلت میں مبدل ہونا لطیف نفسیاتی مطالعہ ہے۔

(۲۸)

اے اسد رویا جو دشتِ غم میں میں حیرت زدہ   آئنہ خانہ ہجومِ اشک سے ویرانہ تھا

مقطع بظاہر سادہ ہے مگر اس میں ارتقائے نفس کا ایک نازک مسئلہ بڑی خوبی سے نظم ہوا ہے۔ شعر کا حاصل یہ ہے کہ منزل معرفت تک رسائی کو میں نے جادۂ غم اختیار کیا کیونکہ غم (جو عشق کا مترادف بھی ہے) بہترین معلم انسان ہے۔ یہ راستہ سخت اور دشوار گذار تھا اور میں اس کی مشکلوں سے ناآشنا تھا لہٰذا مجھ پر حیرت اور اسی کے ساتھ احساس ناکامی سے گریہ طاری ہوا۔ اس گریہ نے جس میں بے چارگی کا اعتراف مضمر تھا، تمام حجابات اٹھا کر اس منزل سے دوچار کر دیا جہاں عقل کی جولانی ختم ہو جاتی ہے اور انسان عشق و وجدان کی رہبری میں منازل سلوک طے کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی کا سنسان صحرا آئینہ خانہ بن گیا۔ حیرت نیز اشکوں کو آئینے سے ربط ہے یا تو کچھ نظر نہ آتا تھا یا ہر ذرہ آئینہ بدست تھا۔ جلوے ہی جلوے پیش نگاہ تھے۔

(۲۹)

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا   غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

یہ مقطع بھی خوب ہے۔ دوستوں کی محبت کا تو ذکر کیا ان کی سرد مہری بھی بیش بہا ہے۔ ان کی کم نگاہیوں سے میرا دل خاک ہو گیا، ویران ہو گیا تاہم زبان آشنائے شکوہ نہ ہوئی بلکہ میں نے شکووں کو غبارِ دل میں دفن کر دیا اور اس طرح ویرانے میں خزانہ کا اضافہ ہوا (یہ ایک قدیم دستور تھا کہ مال و زر کو حفاظت کے لئے صحرا میں چھپا دیتے تھے) اس سے زیادہ دوستوں کی کیا پرستاری ہو سکتی ہے کہ شکوے کے موقع پر بھی شکوہ نہ کیا جائے اور شکوہ نہ کرنے کی لذت کو دولتِ عظمیٰ سمجھ کر کلیجے سے لگا رکھا جائے۔

"کو شایاں" کے بدلے ایسے موقع پر لکھنؤ میں "کے شایاں" مستعمل ہے۔

اب پھر مروجہ دیوان کی طرف رجوع کیجیے۔

(۳۰)

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار　　کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیدادگر کو میں

اقوال شارحین: (۱) احمق لوگ خواہش کو پرستش قرار دیتے ہیں۔ بھلا خواہش اور پرستش ایک چیز کیسے ہو سکتی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں اس بتِ بیدادگر کی پرستش کرتا ہوں حالانکہ امرِ واقع اس کے برعکس ہے مجھے تو محض اس کی خواہش اور آرزو ہے میں اس کا پجاری نہیں۔

(۲) اس شعر میں باریک معنی یہ ہیں کہ شاعر حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ کیا میں اسے پوجتا ہوں۔ اسے خبر نہیں کہ معشوق کے سامنے جا کر اظہارِ نیاز پرستش کی حد تک پہنچ جاتا ہے یا خواہش کی حد تک رہتا ہے اور حیرت کے علاوہ دوسرا پہلو تشنیع کا بھی ہے۔

(۳) ایک صاحب نے پرستش اور خواہش میں فرق نکالا ہے کہ جب پرستش کی جائے گی تو وہ خواہش دل ہی سے ہو گی خواہ اس میں کسی قدر استغراق کیوں نہ ہو اور جس امر میں خواہش دل شامل ہے وہ عبادت نہیں ہو سکتی تو ثابت ہوا کہ عبادت حق کوئی بجا نہیں لا سکتا۔ صرف دنیا یا بندانِ خواہش کو عابد کا خطاب دیتی ہے۔

عرضِ اثر: میں جو مطلب سمجھا ہوں یہ ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ جسے احمق (ظاہر پرست) پرستش سمجھے ہیں وہ دراصل میری خواہش پرستش ہے۔ پرستش کا مفہوم میرے ذہن میں اور ہی کچھ ہے ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی مگر اس کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ خواہش پر پرستش پر لوگوں کو پرستش کا دھوکا ہونے لگا،

(۳۱)

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ثابت ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

اقوال شارحین: (۱) آشفتگی = پریشانی نقشِ سویدا = دل پر ایک سیاہ رنگ کا تل سویدا کیا درست یعنی سیاہی کو دور کر دیا۔

سویدا کو داغ اور آشفتگی کو دود سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ میری آشفتگی اور پریشانی نے داغ سویدا کو درست کر دیا یعنی صاف کر دیا۔ اس داغ کی وجہ سے دل سے اکثر دھواں نکلا کرتا تھا۔ اب دھواں نکل جانے کے بعد دل کا داغ دور ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ داغ کا سرمایہ یا حاصل محض دھواں تھا، وہ دھواں نکل گیا اور دل صاف ہو گیا (۲) دل کا داغ دنیا کی مکروہات میں دل لگانے سے پیدا ہوا تھا (۳) یہ داغ پریشاں حالی میں افشائے راز کے خوف سے آہیں ضبط کرنے کا نتیجہ ہے (۴) جس طرح دھوئیں سے داغ پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح آشفتہ خاطری اور پریشانی سے دل میں داغ سویدا کی صورت قائم ہوتی ہے۔

جملہ حضرات نے آشفتگی کے معنی آشفتہ خاطری اور پریشانی کے لئے ہیں حالانکہ آشفتگی سے غالب کی مراد عشق کی شوریدگی ہے۔ سند میں یہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔

صائب:۔ آشفتگی ز عقل بپرورد دماغ ما فانوس گرد باد شود ہر چراغ ما

مفید بلخی:۔ در چمن ہر چند قامت سر و موزوں می کشد از قدرت آشفتگی چوں بید مجنوں می کشد

صائب کے شعر میں عقل سے بیزاری اور عشق کی طرف میلان کا اظہار ہے۔ مفید بلخی کے شعر میں صاف صاف سرو کی آشفتگی کا سبب معشوق کے قد بالا پر فریفتگی کو قرار دیا ہے۔

نقشِ سویدا یا داغ سویدا حضرات صوفیا میں دل کا وہ نقطہ ہے جس کے ذریعہ

سے جمالِ الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور جسے ذوقؔ نے اس طرح نظم کیا ہے۔

دیکھ اگر دیکھنا ہے ذوقؔ کہ وہ پردہ نشیں — دیدۂ روزنِ دل سے ہے دکھائی دیتا

خود غالبؔ ایک دوسری جگہ کہتے ہیں ؎

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے — سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

یہی داغِ سویدا یا نقشِ سویدا ہے جسے ذوقؔ نے دیدۂ روزنِ دل سے تعبیر کیا ہے ورنہ دل میں روزن یا سوراخ کہاں۔ قاضی محمد صادق خاں اخترؔ کا بھی یہ شعر دعوتِ نظر دیتا ہے ؎

سوادِ اعظم اسرارِ ایزد جس کو کہتے ہیں — بچشمِ غور جو دیکھا تو وہ دل کا سویدا ہے

نقش (سویدا) کیا درست "نقش درست کردن" کا لفظی ترجمہ ہے جس کے معنی ہیں نقش یا تصویر کو نوکِ پلک سے درست کر دینا نہ کہ مٹا دینا یا بالکل دور کر دینا۔

غالبؔ کہتے ہیں کہ سویدا کا نقش اُجاگر نہیں تھا عشقِ شوریدہ نے اُس کی کثافت کو دور کر کے اُس کا صحیح مصرف بتایا کہ دیدارِ محبوب یوں ہی میسر ہو سکتا ہے کہ اُس کو دیدۂ دل سے دیکھو، اپنے اندر تلاش کرو، اپنے سے باہر نہ پاؤ گے اور اس تلاش و حصولِ مقصد کا واحد ذریعہ عشق و وجدان ہے عقل کو یہاں دخل نہیں۔ غالبؔ یہ نہیں کہتے کہ دھوئیں سے داغ پڑ گیا بلکہ یہ کہتے ہیں کہ وہی آشفتگیٔ عشق (جسے داغ کی رعایت سے (بادنیٰ ملابست دھواں کہا ہے کیونکہ دھوئیں میں بھی پیچیدگی اور پریشانی کی صلاحیت ہوتی ہے) داغ کا سرمایہ یا حاصل بن گئی کیونکہ عشق نے سویدا کو دوسرے داغوں سے ممیز کیا اور اُس کا صحیح منشا بتایا۔

(۳۴)

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

اقوالِ شارحین: اضطرابِ شوق اس قدر زیادہ ہے کہ دل میں بھی نہیں سما سکتا

حالانکہ دل میں اس قدر وسعت ہے کہ اُس میں دونوں جہان بآسانی سما سکتے ہیں۔
کہتے ہیں کہ اس قدر فراخی کے باوجود شوق کو تنگ دلی کی شکایت ہے اور یہ شکایت بجا معلوم ہوتی ہے کیونکہ اضطراب شوق کو ضرورت کے مطابق جگہ نہ ملنے سے اس کا جوش اضطراب ٹھنڈا پڑ گیا۔ گویا دریا کا اضطراب موتی میں سما گیا۔ اصل میں موتی کی آب کو دیکھ کر شاعر کا دماغ اس باریک خیال کی طرف متوجہ ہوا اور اُس نے گوہر کو دل اور اضطرابِ شوق کو اضطرابِ دریا سے تشبیہ دے کر یہ لطیف معنی پیدا کیے۔

غالب نے صرف لفظ شوق استعمال کیا، حضرات شارحین اس کو بے تکلف اضطرابِ شوق کہتے ہیں، پھر فرماتے ہیں کہ جوشِ اضطراب ٹھنڈا پڑ گیا یعنی شوق سے بالکل خالی الذہن ہو گئے۔ مزید براں جوشِ اضطراب کے ٹھنڈا پڑنے سے دریا کے اضطراب کو موتی میں سما لینے کی صورتِ جواز کیونکر پیدا ہوئی۔ اضطراب شوق، اضطراب دریا ہے، دل کو گوہر کہہ چکے ہیں لہذا شوق دریا ہوا، اضطرابِ شوق، اضطراب دریا ہوا اور دل گوہر ہوا ایسی حالت میں اُس فراخی و وسعت کا کیا حشر ہوا جسے دل سے منسوب کر چکے ہیں جب دل گوہر ہے اور شوق دریا ہے تو دل دریائے شوق کا گوہر ہوا تاہم یہی شوق یا دریا اپنے گوہر یعنی دل سے تنگیِ دل کا گلہ کرتا ہے عجیب خلط بحث ہے۔

میرا خیال ہے کہ غالب نے دل کی دو مختلف کیفیتوں یعنی شوق و اضطراب کو مدنظر رکھا۔ اضطراب عام اور شوق خاص شوق کیا ہے؟ کسی آرزو کی تکمیل کا خواہش مند ہونا۔ اس تکمیل کے لیے شوق نے پوری کائنات دل کو چھان مارا اور اس قدر کاوش کی کہ اضطراب بھی شوق میں منتقل ہو گیا تاہم شوق کی تکمیل نہ ہوئی اور دل کی تنگی کا گلہ ہے۔ غالب اس کیفیت (عدم تسکین شوق) کی مدلل توجیہ یوں کرتے ہیں کہ پورے دریا کا

اضطراب گوہر میں محو ہو گیا۔ محو ہو جانا فنا ہو جانا نہیں ہے بلکہ ایک شے یا ذات کا دوسری شے یا ذات میں گم ہو جانا ہے۔ اس عدم تکمیل شوق تاہم بقائے شوق و اضطراب کو دوسرے مصرع میں تمثیلاً یوں بیان کرتے ہیں کہ وہ صورت رونما ہوئی جو گوہر میں موج گوہر کی ہوتی ہے (موج میں اضطراب کا وجود بدیہی ہے) اصطلاح شعرا میں موج گوہر وہ روشن ڈورا ہے جو مدوّر بے ڈلک موتی کے گرد ہوتا ہے (میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے) اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برابر گردش کر رہا ہے اور متحرک ہے۔ گوہر بھی تابدار ہوتا ہے لیکن یہ ڈورا اُس سے آب و تاب میں بڑھ چڑھ کر ہوتا ہے۔ سند میں مرزا بیدل کے اشعار اس لئے پیش کرتا ہوں کہ ایک زمانے میں غالب طرز بیدل میں ریختہ کہا کرتے تھے اور زیر بحث مطلع اُسی زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔

دلِ آسودۂ ما شورِ امکاں در نفس دارد (۱) گہر دزدیدہ است اینجا عنانِ موج دریارا
ہمت از ہر دو جہاں جست و ز دل در نگذشت (۲) موج بگذشت ز دریا و زگوہر نگذشت

جیسے بیدل نے گوہر کا عنانِ موج دریا دزدیدن یا "موج زگوہر نگذشت" کہا ہے اُسی بات کو غالب نے اضطراب دریا کے گہر میں محو ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

شعر کا حاصل یہ ہوا کہ جذبۂ شوق نے اپنی وسعت و پہنائی کا اندازہ لگانا چاہا پورے دل پر محیط ہو گیا پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ دل دریا ہے، شوق اس دریا کا موتی ہے جس میں پورے دریا کا اضطراب بشکل موج گوہر جذب ہے۔ شوق پورے دریا پر محیط ہے۔ دریا کے تموج و طوفان (اضطراب) کو سمیٹے ہوئے ہے تاہم تنگیٔ جا کا شاکی ہے گویا وسعتِ مکان و لامکان پر چھا جانا چاہتا ہے۔ بظاہر سعی طلب کی تمام منازل طے کر چکا ہے تاہم قانع نہیں بلکہ اور ترقی کرنا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے جو انسان کی

فطرت کا بلند تقاضا ہے، کبھی قانع نہ ہونا، کسی منزل میں دم نہ لینا۔

(۳۳)

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا

اقوال شارحین: آج مجھے پھر اپنی چشم تر یاد آگئی اور نتیجے کے طور پر میرا دل جگر فریاد کا آرزو مند ہو گیا کہ پھر وہی گریہ و زاری کی لذت حاصل کرے بعض لوگ دیدۂ تر سے معشوق کی چشم تر مراد لیتے ہیں یعنی مجھے معشوق کی چشم تر یاد آئی اور اس وجہ سے میرا دیدہ و دل آرزو مند فریاد ہوا بعض حضرات فرماتے ہیں کہ دل جگر تشنۂ فریاد ہوا تو مجھے دیدۂ تر یاد آگیا کہ یہ تشنگی رونے ہی سے بجھے گی۔

اگر غالبؔ کا یہی مدعا ہے تو ردیف واحد غلط ہوئی جاتی ہے۔ مزید عیب دل اور جگر کے درمیان واو عطف کے حذف کا ہے۔ میرے نزدیک جگر تشنۂ فریاد ترکیب مرکب ہے یعنی دل بذریعہ فریاد جگر کے خون ہونے کا درپے ہوا مطلب یہ ہوا کہ بتقاضائے غم دل مجھے دوبارہ (پھر) دیدۂ تر کی یاد آئی مگر پہلے ہی اتنا رو چکا تھا کہ آنکھ میں ایک قطرۂ اشک بھی نہ تھا دل جو بیتاب گریہ تھا مصر ہوا کہ آنکھ میں آنسو نہیں تو فریاد کرکے جگر کا خون کرو اور اسی خون کے آنسو روو، میری تشنگی شوق کی تسکین بہر صورت ہونی چاہیئے۔ یہ معنی نہ لیجئے تو گریہ اور فریاد میں ربط پیدا ہی نہیں ہوتا۔ فریاد کی تسکین گریہ سے کیونکر ہو سکتی ہے۔

(۳۴)

کیا زہد کو مانوں نہ ہو گرچہ ریائی　　پاداش عمل کی طمع خام بہت ہے

تمام شارحین اس شعر کی شرح میں متفق ہیں اور ان کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ غالبؔ ایسے زہد کو کبھی نہیں مانتے جس میں ریا بالکل نہ ہو کیونکہ اس میں جزا کا خیال بہت زیادہ

ہوتا ہے یعنی زہد وتقویٰ کے بدلے اگلے جہان میں عیش وآرام ملے گا۔ زہد وتقویٰ بغیر جزا کے خیال کے ہونا چاہیے

شارحین نے پاداش کے معنی جزا کے لئے یعنی طلب اجر وثواب، حالانکہ لفظ پاداش مکافات کا مرادف ہے اور اس کا اطلاق جزا وسزا پر یکساں ہوتا ہے غالب نے پاداش عمل، خواہ بامید جزا ہو یا بخوف سزا طمع خام کہا ہے۔ ان کا ادعا ہے کہ زہد ریائی کی زبونی تو بدیہی ہے وہ زہد بھی کسی کام کا نہیں جس میں پاداش عمل یعنی سزا یا جزا کا خیال شامل ہو کیونکہ جہاں ایسا خیال گزرا خلوص رخصت ہوا، عبادت خالصۃً لوجہ اللہ نہ رہی پاداش عمل کو طمع خام اس لئے کہا کہ ذات باری بے نیاز ہے۔ اس کے رحم وکرم، قہر وغضب بخشش ونوازش کا پیمانہ انسان کے اعمال نہیں ہیں بلکہ اس کی صمدیت ہے بہت ممکن ہے کہ ایک شخص عمر بھر آلودۂ معصیت رہے لیکن اس کی کوئی ادا پسند آجائے اور رحمت کا سزاوار ٹھہرے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ عمر بھر کی ریاضت پر ایک لغزش پانی پھیر دے اور جہنم کا مستحق بنا دے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ پاداش عمل سے یکسر بے تعلق ہو کر اپنے ہی نفس کی پاکی اور صفائی، فروتنی اور خدمت خلق میں منہمک رہنا چاہیے۔ بندگی میں بھی یہی اصول برتا جائے مگر زاہدوں میں یہی بات نہیں پائی جاتی۔ پاداش عمل کی طمع خام سے چھٹکارا نہیں ہوتا ہے۔

(۳۵) ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

اقوال شارحین: (۱) بہشت کو تحقیراً گلدستے کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ لطف یہ ہے کہ گلدستہ سجاوٹ کے لئے طاق ہی پر رکھا جاتا ہے۔ تشبیہ بالکل اچھوتی ہے، (۲) ہم

بیخودی کے ایسے خوشگوار عالم میں ہیں جس کے مقابلے میں ہم نے جنت کو فراموش کردیا ہے۔
کسی صاحب نے لفظ بے خودی کا صحیح مفہوم متعین کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔
اصطلاحِ تصوف میں بیخودی کے معنی ہیں غیر خدا سے منہ پھیر لینا اور اُس کی یاد میں ایسا محو رہنا کہ ہر شے سے حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جانا۔ اسی مطلب کو یوں بھی ادا کرتے ہیں کہ اپنے سے غیبت خدا سے حضوری ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص خدا سے لو لگائے گا اور ماسوی اللہ سے بے تعلق ہو جائے گا اُس کی نظر میں بہشت کی وقعت گلدستہ طاقِ نسیاں سے زیادہ نہ ہوگی۔ اسی میں شریعت اور طریقت کا فرق مضمر ہے۔ شریعت میں جنت وہ ہے جہاں مادی اسباب راحت کے ساتھ ساتھ سکونِ قلب وطہارتِ نفس میسر ہو۔ طریقت میں بہشت مراد ہے دیدارِ خدا سے۔ بقول میر ؎

شیخ جنت تجھے، مجھے دیدار ۔۔۔۔۔ واں بھی ہر اک کی ہے جدا قسمت

(۳۶) اسی خیال کو غالب نے اس طرح بھی نظم کیا ہے :

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن ۔۔۔۔۔ دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

غالب جنت کے نہیں بلکہ عام تصورِ جنت کے منکر ہیں۔ یہ کوئی مخصوص جائے آسائش نہیں بلکہ قرب کی منزل ہے۔ نفس مطمئنہ کی ایک کیفیت ہے۔

(۳۷)

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل ۔۔۔۔۔ کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

عام طور پر لوگوں نے اس شعر سے یہ مطلب نکالا ہے کہ غالب غزل سے بحیثیت صنفِ سخن غیر مطمئن تھے اور اس کی تنگ دامانی کے شاکی تھے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس مخصوص غزل میں جس کا جزو شعر زیر بحث ہے تجمل حسین خاں کی شان میں مدحیہ اشعا

شامل کرنا چاہتے تھے۔ غزل میں قصیدے کا پیوند لگاتا تھا۔ اس کی تمہید اور معذرت میں کہا کہ "بقدرِ شوق......" اگر غزل کو صنفِ سخن کی حیثیت سے ناکافی سمجھتے اور اس بنا پر بیزار ہوتے تو لفظ شوق کی جگہ لفظ ذوق استعمال کرتے کیونکہ ذوق کا تعلق عام رجحان اور افتادِ طبیعت سے ہے اور شوق محض خواہش و ولولہ ہے۔ جو وقتی بھی ہو سکتا ہے۔ میرے ادعا کا ثبوت خود غزل کے آخری دو شعروں میں موجود ہے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے (۱) سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا (۲) صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

"ادائے خاص" بھی عشقیہ غزل میں مدح سرائی کا شمول ہے جس کے لیے قصیدہ موزوں ہے نہ کہ غزل

(۳۸)

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے گردشِ مجنوں بچشمکہائے لیلےٰ آشنا

غالب کا یہ شعر ان کے انفرادی رنگ اور تخیل کی نادرکاری کا آئینہ دار ہے۔ دنیا کو باعتبارِ تغیرات و فنا آمادگی میخانۂ نیرنگ اور ذروں کو جو تغیر و فنا کی نشانیاں ہیں ساغر میخانۂ نیرنگ کہنا، پھر اس طلسمِ آبادی و ویرانی یا آبادی و ویرانی کو گردشِ مجنوں سے تعبیر کرنا اور چشمکہائے لیلےٰ (اشارۂ مشیت) کا رازداں کہہ کر جوشِ رقص و مستی و میخانہ آرائی دکھا دینا اور لفظ چشمک لا کر تال سم پیدا کر دینا حسنِ تخیل و جولانیٔ فکر کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ شعر میں حکمت و فلسفہ و تصوف کا وہ بدیع امتزاج ہے کہ باید و شاید۔

(۳۹) بندِ اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں

تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

قول شارحین: مرزا کا یہ شعر بیت الغزل اور نشتر کہلاتا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ کہتا ہے

کہ جس کے ساتھ تو ہم خواب ہوا اور جوشِ اختلاط میں جس کے شانوں پر تیری عنبریں زلفیں پریشاں ہوئیں اُس کے دماغ کے کیا کہنے ہیں نیند اُس کی قابلِ رشک ہے۔ راتیں اُس خوش قسمت شخص کی صحیح معنوں میں راتیں کہلانے کی مستحق ہیں اور جس کو یہ لطف حاصل نہیں، نہ اُس کا دماغ ہے، نہ نیند ہے نہ راتیں ہیں بلکہ وہ ہمہ تن رنج و تعب ہے۔

عرضِ اثر: شعر میں "نیند اُس کی ہے" کا ٹکڑا بہت بلیغ اور اہم ہے۔ اس نے وصل کو خواہشاتِ جسمانی کی آسودگی سے مرتفع کر کے روحانیت میں مبدل کر دیا ورنہ وصل کا جو عام مفہوم ہے اُس میں نیند کہاں۔ بقولے!

"یار کو میں لے مجھے یار نے سونے نہ دیا"

"نیند اُس کی ہے" اس ٹکڑے سے واضح ہوا کہ قربِ معشوق نے بے قراری و اضطراب کا خاتمہ کر دیا۔ یہ حالت اُسی وقت تک تھی جب تک مطلوبہ شئے دسترس سے باہر تھی جب معشوق مل گیا تو سکونِ کامل میسر ہوا۔ اب نیند اُس کی نیند ہے، دماغ اس کا دماغ ہے اور راتیں اُس کی راتیں ہیں خواب میں بھی اور عالمِ بیداری میں بھی۔ شعر کی غیر متحرک اور خاموش مصوری نے کہ معشوق کی زلفیں اس کے شانوں پر بکھری ہوئی ہیں اور یہ محوِ خواب نوشیں ہے۔ دو جسموں کا نہیں بلکہ دو روحوں کے مکمل باہمی جذب کا پیکر بنا دیا۔ کسی قدیم شاعر کا مشہور قطعہ ہے۔

کسی کی شبِ وصل سوتے کٹے ہے — کسی کی شبِ ہجر روتے کٹے ہے
ہماری یہ شب کیسی شب ہے کہ یا رب — نہ سوتے کٹے ہے نہ روتے کٹے ہے

میر کہتا ہے:

وعدۂ وصل رہا ہے شبِ آئندہ پہ میر — بختِ خوابیدہ جو ٹک جاگے تو سو دیں گے کل

عشق میں وصل کا یہی صحیح معیار ہے جس کو بوالہوسوں نے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

(۴۰)

حسرت نے لا رکھا تری بزم خیال میں　　گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

قول شارحین: تیری بزم خیال سے مراد میرا دل ہے۔ سویدا وہ سیاہ داغ جو دل میں ہوتا ہے۔ حسرت نے تیری بزم خیال (یعنی میرے دل میں) تیری رنگین نگاہوں کا ایک گلدستہ لا رکھا ہے جس کو سب سویدا کے نام سے پکارتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ گلدستہ بزم کے لئے باعثِ زینت ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں جو خال سویدا ہے وہ تیری حسرت بھری نگاہوں کا گلدستہ ہے۔ اپنے دل کو معشوق کی بزم خیال اس لئے کہا ہے کہ اس میں معشوق کا خیال جلوہ گر رہتا ہے۔

عرض اثر: معشوق کی نگاہیں اور حسرت بھری! "تری بزم خیال" سے ایسی بزم مراد ہے جو معشوق (حقیقی) کی عدم موجودگی (عدم حصول دیدار) میں تصور نے دل میں آراستہ کی ہے۔ سویدا محض سیاہ نقطہ یا خال نہیں بلکہ جیسا پہلے کہیں توجہ دلا چکا ہوں) وہ آلہ ہے جس کی اعانت سے اربابِ تصوف کے نزدیک دیدار خدا حاصل ہوتا ہے۔ اسی سے نقش سویدا کو گلدستۂ نگاہ کہا چونکہ معشوق حقیقی کے مشاہدۂ جمال کا ذریعہ ہے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ ظاہری آنکھوں سے خدا کا دیدار نا ممکن ہے مگر شوق کا تقاضا ہے کہ دیکھئے اس کی تکمیل کے لئے بزم خیال ترتیب دی اور اس بزم کو حسرت دیدار نے اپنی تسکین کی خاطر گلدستۂ نگاہ (نقش سویدا) سے آراستہ کیا۔

انتخاب غزلیات غالب

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی دردِ بے دوا پایا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

یہ لاشِ بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشکِ آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا دفتر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بت کدے کا در کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
دگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات — عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل — کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو — اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا
فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد — دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگئ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخ مکتوب
مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا

ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشم بینا کا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پہ ہوا

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

تنگئ دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

وہ مری چینِ جبیں سے غم پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطی عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا؟

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

بمہ نا امیدی، ہمہ بدگمانی
میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستمہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا

تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب
یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اس کے ہجر میں
بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ وفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور　　کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات　　دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہرچند سبک دست ہوئے بت شکنی میں　　ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے　　رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے　　متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا　　فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے　　کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے　　کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ　　قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز　　دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود　　ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرائشِ خمِ کاکل　　میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد　　ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز

وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے　　ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

مجھکو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا — میں غریب اور تو غریب نواز
اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رند شاہد باز

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے — دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی ہے ہے — بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک — کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیٔ بزم ہے یک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

گر تجھکو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو — رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور — رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصت کاروبار شوق کسے
ذوق نظارۂ جمال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانی خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم نام خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اُس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ہرچند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے ہرچند پشتِ گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

رنجِ نومیدیِ جاوید گوارا رہیو خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

عشق تاثیر سے نومید نہیں جاں سپاری شجرِ بید نہیں

سلطنت دست بدست آئی ہے جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں

ہے تجلی تری سامانِ وجود ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں

رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے
سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں وہ جو لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ یوں ہیں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہ گزر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بتِ بیداد گر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کو
سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمھیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ استاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت — یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ — تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا پتا نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزارِ باد یاں

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں — آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں
تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالبؔ — یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

نشہ رنگ سے ہے واشدِ گل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ — ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرت حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اُٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حسن اور اس پہ حسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عز و ناز یاں وہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں
میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیئے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں
گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں
جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکے ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو — کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو — کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ — ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ — اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجئے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو
تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو
ابھرا ہوا نقاب میں ان کے ہے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو
سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال — کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیوں کر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے — حیا ہے اور یہی گومگو، تو کیوں کر ہو
جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں
سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سر گراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو
نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو
وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں
عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو
کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی
بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو
نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسب گردشِ پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے بانداز چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے — تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد — زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

غالبؔ ترا احوال سنا دیں گے ہم اُن کو — وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارہ نہیں کرتے

انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا — اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی
کہوں کیا خوبی اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ — بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے — میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

دردسے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے — کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجکو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں — ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی — اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال — ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ — مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی — اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں — ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

بیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے — نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

عشق مجکو نہیں وحشت ہی سہی — میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے — کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے — غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ڈھونڈے ہے اُس مغنیِ آتش نفس کو جی | جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے
مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال | تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ | شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ | ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے | بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم | تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں | بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

نظارہ کیا حریف ہو اُس برقِ حسن کا | جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں | مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے
گزرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے | قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے | میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی جو اندیشے میں ہے | آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے
گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق | پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے
ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا | رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے
نقش کو اُس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں | کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم | لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے
کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم | کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے | برقِ خرمنِ راحت خونِ گرمِ دہقاں ہے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ | ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے بایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے
بس ہجومِ نا امیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے
رنج رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
دیکھو تو دل فریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
مارا زمانے نے اسداللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ — مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز — (ق) گرم بازارِ فوج داری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر — زلف کی پھر سر رشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال — ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب — اشک باری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا — آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بیخودی بے سبب نہیں غالبؔ — کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی
کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا فکرِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبحدم جو دیکھیے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و شور نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی خواہش
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
ورنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو
کاشکے تم مرے لئے ہوتے

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دئے ہوتے

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر
کچھ تجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر روکش سطح چرخ مینائی
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی
سبزہ و گل کے دیکھنے کے لئے چشم نرگس کو دی ہے بینائی
ہے ہوا میں شراب کی تاثیر بادہ نوشی ہے بادپیمائی

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری
قدر سنگ سر رہ رکھتا ہوں سخت ارزاں ہے گرانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی لکھ دیجیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی
اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
چاک مت کر جیب بے ایام گل کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے
دوستی کا پردہ ہے بیگانگی منھ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے
منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے
غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے
چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے — آئینہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل — اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے — ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا — تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے — پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ہاں مت کھائیو فریبِ ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ — آخر تو کیا ہے، اے نہیں ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی — وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ — خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب — کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال — کہ یہ کہے کہ "سرِ رہ گزر ہے، کیا کہیے"

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے — ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

مرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی — لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے — تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

طبع ہے مشتاق لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالب مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

رگ دیے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھئے کیا ہو
ابھی تو تلخیٔ کامِ دہن کی آزمائش ہے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے
نہ پوچھا جائے ہے اُس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے
کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ تقریر
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا
کیوں کر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہمراز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے
تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ
کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سرو سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسد
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ — کیوں کسی کا گلا کرے کوئی

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی — یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

بہت سہی غمِ گیتی شراب کیا کم ہے — غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک — آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے — بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن — بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا — اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے — موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی — قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا — مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی — کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

نشارنگی خلوت سے بنتی ہے شبنم — صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب — اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں گلدستۂ نگاہ کہ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

غالبؔ برا نہ مان جو واعظ برا کہے ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق آئینہ باندازِ گل آغوش کشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

خو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

اک خوں چکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

آمد بہار کی ہے. جو بلبل ہے نغمہ سنج اڑتی ہوئی خبر ہے زبانی طیور کی

گو واں نہیں وہاں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارۂ جمال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال
صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا
جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

محمل پیمانۂ فرصت ہے بر دوشِ حباب — دعوئ دریاکشی و نشہ پیمائی عبث

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ — متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسد — خدا کے واسطے اے شاہِ بے کساں فریاد

ظلم کرنا گدائے عاشق پر — نہیں شاہانِ حسن کا دستور

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے — دشمنی ہے وصال کا مذکور

ہیچ ہے قدرِ جنوں آشفتہ سامانی بغیر — ننگ وحشت ہے گریباں چاک دامانی بغیر

پائے بندِ عشق رسمِ دہر سے آزاد ہیں — کر رہے ہیں ذکر تیرا سبحہ گردانی بغیر

دل کا پہلے خوگرِ آلام ہونا شرط ہے — کوئی مشکل رہ نہیں سکتی ہے آسانی بغیر

فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ — نگاہ عکس فروش و خیال آئنہ ساز

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے — کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی

سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

کیوں نہ طوطئ طبیعت نغمہ پیرائی کرے — باندھتا ہے رنگِ گل آئینہ بر چاکِ قفس

عشاق اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ — دیتا ہے اور جوں گل و شبنم بہار داغ

بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال — غافلاں نقصاں سے پیدا ہے کمال

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی — ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال

شوق بے پروا کے ہاتھوں مثلِ سازِ نادرست

کھینچتا ہے آج نالے خارج از آہنگِ دل

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں — میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

درشتیِ تامل پنبۂ گوشِ حریفاں ہے — وگرنہ خواب کی مضمر ہیں افسانے میں تعبیریں

ہر حال میں ہیں مرضیِ صیاد کے تابع — ہم طائرِ پرسوختہ رشتہ بپا ہیں

ہم بیخودیِ شوق میں کر لیتے ہیں سجدے — یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں

دشتِ وحشت میں نہ پایا کسی صورت سے سراغ — گردِ جولانِ جنوں نے بھی پکارا ہم کو

حسن بے پروا گرفتارِ خود آرائی نہ ہو — گر کمیں گاہِ نظر میں دل تماشائی نہ ہو

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ — خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ، بلا سمجھ

گاہ بہ خلد امیدوار گہ بہ جحیم بیمناک — گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ

نہ پوچھ حال اس انداز اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ

حال آنکہ اب زباں کو نہیں طاقتِ فغاں — پر دل یہ چاہتا ہے کہ فریاد کیجیے

درد ہو دل میں تو دوا کیجیے — دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجیے

رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی — پہلے دل درد آشنا کیجیے

عرضِ شوخی نشاطِ عالم ہے — حسن کو اور خودنما کیجیے

دشمنی ہو چکی بقدرِ وفا — اب حقِ دوستی ادا کیجیے

موت آتی نہیں کہیں غالبؔ — کب تک افسوس زیست کا کیجیے

وفورِ خودنمائی رہنِ ذوقِ جلوہ آرائی — بوہم کامرانی جذبِ دل کو شادمانی ہے

اس جور و جفا پر بدظن نہیں ہم تجھ سے — کیا طرفہ تمنا ہے امیدِ کرم تجھ سے

غالبؔ کی وفاکیشی اور تیری ستم رانی — مشہورِ زمانہ ہے اب کیا کہیں ہم تجھ سے